شرط

نبیلہ عزیز



شرط

''زیست......زیست......مرگئی ہو؟ جواب تو دے دو......'' سحرش اسے پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ محترمہ زیست صاحبہ ابھی تک بیڈ پر لیٹی خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہوں گی، مگر خلاف توقع اسے بیڈ کے بجائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا دیکھ کر اسے چپ چڑھ گئی تھی۔وہ اپنی گھنی، لانبی مڑی ہوئی پلکوں پہ بڑی مہارت اور بڑی احتیاط کے ساتھ مسکارا لگانے میں مصروف تھی۔اس نے سحرش کے پکارنے کا یا پھر اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا، بس اپنے کام میں مشغول رہی تھی، انتہائی انہماک کے ساتھ۔

''گونگی ہوگئی ہو۔جواب نہیں دے سکتیں؟''

وہ غصے سے کہتی ہوئی دروازے کی چوکھٹ سے ہٹ کے اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

''جب تک میں مسکارا نہ لگالوں، چپ چاپ کھڑی رہو۔'' دوبارہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے اپنے سابقہ کام میں مصروف ہوگئی تھی۔ اپنے حسن کی نوک پلک سنوارنا اسے خوب آتا تھا، وہ اپنی خوب صورتی سے اچھی طرح آگاہ تھی۔وہ اپنے آپ کو ذرا سا سنوار لیتی تھی تو بھی اس کی خوب صورتی دو آتشہ ہو کے سامنے آتی تھی۔دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

زیست نے مسکارا بند کر کے رکھتے ہوئے کاجل اٹھالیا اور آئینے میں بغور دیکھتے ہوئے دونوں آنکھوں میں کاجل کی لکیر کو برابر کیا تھا۔

''اب بولو، کیا بات ہے؟'' اس نے میک اپ کے سامان سے پنک کلر کا بلش آن ڈھونڈا، انداز کافی لاپروا اور شاہانہ تھا۔سحرش جل کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

لپ اسٹک اس کے میک اپ کا آخری ٹچ تھا، جس کے بعد اس نے بال سنوارے اور ہلکی پھلکی جیولری پہن کر حسن کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو پلٹ کر سحرش کی طرف چلی آئی تھی۔

''ہیں؟ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟''

''میں نہیں ہو رہی تیار، میں نے نہیں جانا تم لوگ جاؤ۔'' وہ رخ موڑتے ہوئے کتاب لے کر بیٹھ گئی۔

''کیوں؟ کیوں نہیں جا رہی ہو تم؟ ہم لوگوں کی تیاری کروا کے اب تمہیں نہ جانے کا خیال آیا ہے؟ مسئلہ کیا ہے؟'' زیست کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔

پچھلے دو ہفتوں سے وہ لوگ روزانہ پروگرام بناتی تھیں کہ سنڈے کے روز گھومنے پھرنے اور ہوٹلنگ کرنے چلیں گی اور پچھلے دو ہفتوں سے ان کا جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔اپنی اپنی پاکٹ منی جمع بھی کر رکھی تھی تا کہ شاپنگ زیادہ ہو سکے۔اور آج ان کا پکا پروگرام تھا لیکن عین

نائم پہ سحرش کا انکار؟

''مسئلہ کوئی بھی ہو، بس میں نہیں جاؤں گی۔'' سحرش سنجیدہ تھی۔

''انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟'' زیست جھنجلائی۔

''وجہ یہ ہے کہ سحرش کے نئے کلر سوٹ کا دوپٹہ جل گیا ہے، وہ بھی تمہاری والی استری سے جس کو اتنے دنوں سے خراب کر کے تم نے ہمارے کمرے میں ڈال رکھا تھا۔'' ثانیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زیست کی بات سن لی تھی۔

سحرش بیڈ پہ بیٹھی کتاب چہرے کے سامنے کیے ان دونوں کی موجودگی اور گفتگو سے لاتعلق نظر آ رہی تھی۔ ''تو یار! کسی اور سے پوچھ لیتے ہیں! اتنا بڑا ہاسٹل ہے، لڑکیوں اور دوپٹوں سے بھرا پڑا ہے، کسی سے تو مل ہی جائے گا۔''

''ہاں ہم ہر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہتے ہیں، کیا آپ کے پاس لائٹ پرپل کلر کا دوپٹہ ہے؟ اگر ہے تو پلیز آج شام تک ادھار دے دیں، ہماری بچی کا دوپٹہ جل گیا ہے، وہ بے چاری بیٹھی رو رہی ہے، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ وغیرہ وغیرہ!'' ثانیہ نے کافی سلگ کر تمسخرانہ انداز میں نقشہ کھینچا تھا۔

''ہاں تو کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔'' اس نے لاپرواہ انداز میں کہہ کر کندھے اچکائے تھے۔

''اور ایسا کام یقیناً تم ہی کر سکتی ہو ہم سے تو نہیں ہو سکتا۔'' ثانیہ نے اسے جتایا تھا۔

''ہاں واقعی، ایسا کام میں ہی کر سکتی ہوں کیونکہ ایسے کام کرنے کے لیے انسان میں کچھ ایکسٹرا کوالٹیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم کپڑے چینج کرو سحرش میں ابھی دوپٹہ لے کر آتی ہوں۔'' زیست کہتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔

سحرش کو زیست کے مزاج کا بخوبی پتا تھا، وہ جتنی شرارتی اور خوش مزاج تھی اتنی ہی ضدی اور غصیلی بھی۔ اور اس وقت وہ اس کے لیے دوپٹہ ڈھونڈنے گئی ہوئی تھی اور اسے کپڑے چینج کرنے کا کہہ گئی تھی۔ لہٰذا بہتری اسی میں تھی کہ اس کے آنے سے پہلے کپڑے چینج کر لیے جائیں، سو کتاب سائیڈ پہ رکھی اور ثانیہ سے کپڑے لے کر واش روم میں چلی گئی۔

''ہیلو گرلز، کیا ہو رہا ہے؟'' رمشا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کافی فریش اور کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا لیکن اندر قدم رکھتے ہی حیرت سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔

''ہائیں؟ یہاں اتنی ویرانی کیوں ہے؟ کہاں گئیں سب؟''

''محترمہ زیست صاحبہ، سحرش کے لیے دوپٹہ ڈھونڈنے، بلکہ کسی سے مانگنے گئی ہیں اور محترمہ سحرش صاحبہ کپڑے چینج کرنے واش روم گئی ہوئی ہیں۔''

''یار! ہم تو اپنے ٹائم سے کافی لیٹ ہو جائیں گے؟'' رمشا کو فکر نے آن گھیرا۔

''کوئی بات نہیں، زیست صاحبہ وہ بھی مینیج کر لیں گی۔'' ثانیہ کو زیست کے ہر فن مولا ہونے پر چڑ ہوتی تھی۔ وہ اپنی بات سے، اپنے کہے سے

پیچھے نہیں ہٹتی تھی، جس کام کا ارادہ کر لیتی وہ کر کے ہی رہتی تھی اور ایسے میں ثانیہ اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے آنکھیں پھیر لیتی تھی، جہاں زیست کی تعریف کا کوئی پہلو نکل رہا ہوتا، وہاں بھی بخل سے کام لے جاتی تھی، لیکن زیست کو اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ثانیہ سے نوک جھونک چلنے کے باوجود ثانیہ کو بھی اتنا ہی چاہتی تھی جتنا سحرش، ارمین اور رمشا کو، اسے پانچ دوستوں کا یہ گروپ بہت عزیز تھا۔ جسے اس نے "فائیو اسٹارز" کا لقب دے رکھا، حقیقت یہ تھی کہ وہ زیادہ دیر دل میں میل نہیں رکھتی تھی، اس کی نیت اور اس کا دل سب کے لیے ایک جیسا تھا نرم اور صاف شفاف۔

جیسے ہی سحرش کپڑے بدل کر آئی زیست اور ارمین نے بھی اسی وقت کمرے میں قدم رکھا تھا، زیست کے ہاتھ میں لائٹ پرپل کلر کا استری شدہ دوپٹہ تھا۔

"اب اور کیا کرنا ہے؟" وہ سحرش سے پوچھ رہی تھی۔ "کچھ نہیں، میں بس یہ لپ اسٹک لگا کر جیولری پہن لوں، جیولری کے نام پر صرف بریسلٹ اور آویزے وغیرہ ہی تھے جو ان سب ہی نے پہن رکھے تھے، یہی ان کی جیولری کی حد تھی۔

وارڈن کو پہلے ہی بتا رکھا تھا، اس لیے انہیں ہاسٹل سے نکلنے میں محض پانچ منٹ لگے تھے۔

☆☆☆

"یار اب بس بھی کرو اور کتنی شاپنگ کرو گی؟ مجھے تو اب بھوک بھی لگنے لگی ہے۔" زیست اپنے لیے بلیک جینز اور ساتھ میں ڈھیلا ڈھالا کرتا پسند کر رہی تھی، جب رمشا نے دہائی دی تھی۔ زیست جب سے شاپنگ مال میں داخل ہوئی تھی کچھ نہ کچھ خریدتی جا رہی تھی، اس نے زیادہ کپڑے اور جوتے ہی خریدے تھے اور ہمیشہ شاپنگ کے دوران اس کی اولین ترجیح کپڑے اور جوتے ہی ہوتے تھے۔

"لیکن یار! میری ابھی کچھ اور چیزیں رہتی ہیں، وہ تو لے لوں؟" زیست کو اپنی چیزوں کی لسٹ یاد آ گئی۔

"ہرگز نہیں، اب ذرا بھی صبر نہیں ہو رہا، باقی چیزیں نیکسٹ سنڈے کو آ کر لے لینا۔" رمشا نے اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے زیست کو شاپنگ مال کے مرکزی دروازے کی سمت کھینچا تھا۔

ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی ان پانچوں کی ہنسی یک دم تھم گئی تھی، کیونکہ ان پانچوں کی نظر بیک وقت سامنے کی طرف اٹھی تھی جہاں ان کا یونیورسٹی فیلو، کسی لڑکی کے ساتھ مسکراتا ہوا ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہا تھا اور اس کو ایسے پُرسکون اور بے فکر سے انداز میں دیکھ کر ان پانچوں میں سے ایک کا دل جیسے بجھ کر راکھ ہو گیا تھا، چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا تھا، جیسے اس کے ہاتھ سے کوئی چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھن گئی ہو۔ زیست بمشکل اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر ٹیبل تک لائی تھی اور خود ہی کرسی کھینچ کر اسے بٹھایا بھی تھا۔ سب ہی اپنی اپنی چیئرز پر بیٹھ گئیں، لیکن سبھی اپنی اپنی جگہ پہ خاموش تھیں، معاملہ ایک کا تھا، لیکن دکھ اور افسوس پانچوں کو ہو رہا تھا۔

"احسان اعظم کے ساتھ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے بھلا؟" زیست جیسے خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کی منگیتر ہی ہو گی، وہ بغیر کسی رشتے کے اور بغیر کسی وجہ کے لڑکیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا عادی نہیں ہے۔" یہ اظہار خیال ثانیہ کا تھا۔

"ضروری تو نہیں کہ منگیتر ہی ہو، اس کی کزن بھی تو ہو سکتی ہے؟" سحرش نے خوش گمانی کا دامن تھاما۔

"پہلے کبھی اس کی کسی کزن کو اس کے ساتھ دیکھا ہے تم نے؟" ارمین نے اس کی خوش گمانی پہ پانی پھیر دیا۔

"تم بتاؤ رمشا! احسان اعظم کے ساتھ وہ لڑکی کون ہو سکتی ہے؟" زیست نے گم صم بیٹھی رمشا کو دیکھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ رو دینے کو تھی۔ لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"اپنی ان ہی باتوں کی وجہ سے تو تم آج یہ دن دیکھ رہی ہو، اونہہ اتنی جلدی ہتھیار ڈالنا ہوتے ہیں تو ایسے کاموں میں ہاتھ ہی کیوں ڈالتی ہو؟" زیست کو رمشا پر ایک دم سے غصہ آیا تھا۔

"میں نے ہتھیار ڈالے ہیں یا پھر وہ خود ہی ایسا ہے، بے حس اور پتھر۔ میری محبت، میری دیوانگی کچھ بھی تو اثر نہیں کر سکیں اس پہ؟" رمشا اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکے ہوئے تھی۔

"ہاں تو ٹھیک کرتا ہے نا، جب تمہیں خود ہی اسے متوجہ کرنا نہیں آتا تو وہ بھلا کیسے توجہ دے؟" زیست کو غصہ آتا تو وہ کسی کو بھی کھری کھری سنا سکتی تھی۔ مقابل چاہے کوئی بھی ہوتا۔ اور اس وقت رمشا کی طبیعت صاف ہو رہی تھی۔

"کیسے متوجہ کرتی، یہ تو دل کے معاملے ہیں، یہاں کسی کو زبردستی مجبور نہیں کیا جاسکتا نہ کسی کا دل جیتا جاسکتا ہے۔"

"اونہہ! یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ مردوں کا دل جیتنا کون سا مشکل کام ہے۔ بس انسان میں صلاحیت ہونا چاہئے۔ افسوس رمشا بی اماں میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ تم کسی مرد کا دل قابو کرسکو۔"

زیست غصے کے باعث جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی، مگر ثانیہ کو اس کی بات بہت چبھی تھی۔

"کیا تم ایسا کرسکتی ہو؟ کسی بھی مرد کا دل جیت سکتی ہو؟" ثانیہ نے کافی طنزیہ اور تمسخرانہ انداز میں پوچھا تھا۔

زیست اس کے سوال پہ چونک گئی، مگر ڈگمگائی نہیں تھی۔

"ہاں میں ایسا کرسکتی ہوں، میں کسی بھی مرد کو بے وقوف بنا سکتی ہوں، رمشا تو سچی محبت کر کے بھی ناکام رہی ہے مگر میں جھوٹی محبت کا ناٹک کر کے ہی کسی کو پاگل بنا سکتی ہوں۔" زیست نے پورے اعتماد اور یقین سے کہا تھا۔

"یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں محترمہ زیست صاحبہ!" ثانیہ طنزیہ مسکرائی۔

"میں اگر اسے ثابت بھی کردوں تو؟" زیست چیلنجنگ انداز میں بولی۔

"تو میں تمہیں دس ہزار کیش دوں گی انعام میں، اور اسی جگہ اسی ہوٹل میں ڈنر بھی دوں گی اور اگر تم ہار گئیں تو تمہیں بیس ہزار کیش اور اسی ہوٹل میں ڈنر دینا پڑے گا۔" ثانیہ نے شرط لگائی۔

"ٹھیک ہے مجھے یہ شرط منظور ہے اب تم بتاؤ کون ہے وہ، جس کا دل مجھے جیتنا ہے؟" زیست نے ہامی بھرلی تھی جبکہ سحرش اسے ایسی شرط قبول کرلینے پہ گھورتی رہ گئی تھی۔

"ہوں! بتاتی ہوں۔" ثانیہ نے پُرسوچ انداز میں کہتے ہوئے آس پاس نظر دوڑائی مگر کوئی ایسا چہرہ یا پرسنالٹی نظر نہ آئی جس کا وہ اس شرط کے لیے انتخاب کرتی، چاروں طرف دیکھتے ہوئے مایوس ہوگئی تو بے ساختہ اس کی نظر دروازے کی سمت اٹھی جو ثانیہ کے بالکل سامنے تھا، جبکہ زیست کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

سامنے والے کی پرسنالٹی ایسی تھی کہ ثانیہ کے چہرے پہ چمک آگئی تھی۔

"یہ جو آدمی اس طرف آرہا ہے تمہیں اسی کو بے وقوف بنانا ہے۔"

ثانیہ نے آہستگی سے کہا تھا۔ زیست نے اطمینان سے گردن موڑ کر دیکھا تھا۔ پرسنالٹی واقعی ہی غضب کی تھی، وہ اتنی آسانی سے بے وقوف بننے والا لگتا نہیں تھا۔

بیٹھے بیٹھے، باتوں باتوں میں ان لوگوں نے اتنی بڑی شرط، اتنی آسانی سے لگائی تھی کہ ایک پل کے لیے بھی اچھا برا نہیں سوچا تھا لیکن ان دونوں سے ہٹ کر سحرش کافی متفکر ہو رہی تھی، کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو ثانیہ تو صاف بچ نکلے گی، لیکن زیست ضرور پھنس جائے گی اور اسی ڈر سے سحرش نے زیست کو آنکھوں ہی آنکھوں میں باز رہنے کے کئی اشارے کر ڈالے تھے۔ مگر وہ باز رہنے والی کب تھی؟ اپنے کہے سے پیچھے ہٹنا اس کے لیے بہت ہی مشکل کام ہوتا تھا، شاید یہ بھی اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی خاصیت تھی۔

"زیست یہ بہت خطرناک کام ہے، اس میں ہاتھ مت ڈالو۔" سحرش روہانسی ہو کر بولی۔

"خطرناک کام میں ہی تو مزہ آتا ہے ڈیئر!" زیست لاپروائی سے مسکرا کر کہتی اپنے بیگ سے موبائل اور والٹ نکالنے لگی۔ اتنے میں کسی کے موبائل کی رنگ ٹیون بجنے لگی۔ زیست نے چونک کر آواز کی سمت میں دیکھا، اس آدمی کا موبائل بج رہا تھا، زیست کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے سیل پر آنے والی کال یقیناً ڈس کنیکٹ کر چکا تھا، شاید وہ کھانے کے دوران ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن دوسری طرف بھی کوئی مستقل مزاج آدمی تھا، سیل دوبارہ بجنے لگا، زیست کو اپنی پلاننگ آسان لگنے لگی تھی۔ اس کے وہاں پہنچنے تک وہ کال دوبارہ بند کر چکا تھا۔

"ایکسکیوزمی سر! کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" زیست اس کے قریب کھڑی پوچھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر زیست کی سمت دیکھا۔ لائٹ گرے اور لائٹ پنک کلر کے کمبی نیشن کی لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس، بالوں میں براؤن کلر لگا سر اٹھائے، تیکھے اور پرکشش نین نقوش کی مالک انتہائی اسٹائلش لڑکی بہت اعتماد سے اس کے مقابل والی چیئر پر بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ وہ حیران تو ہوا، مگر پھر بھی اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔

"بیٹھیے پلیز۔" اس نے اشارہ کیا۔

"تھینک یو۔" سنجیدگی سے شکریہ ادا کرتی وہ بیٹھ گئی۔

"سوری سر! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا، لیکن میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔" وہ انتہائی سنجیدہ و شائستہ انداز میں بات کر رہی تھی۔ جبکہ وہ شخص سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی اس کا فون ایک بار پھر بجا تھا۔

"ہیلو؟" اس نے کال ریسیو کر لی۔ زیست اسے سرتاپا جائزہ لیتی نظروں سے دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں اس کی پرسنالٹی کو سراہے بنا نہ رہ سکی تھی۔ وہ حقیقتاً مردانہ وجاہت سے مالا مال تھا۔ اس کی شاندار شخصیت پہلی نظر میں ہی متاثر کرنے کی خاصیت رکھتی تھی۔

"میں کل آپ کو آفس میں ملوں گا اس وقت بزی ہوں، بائے۔" اس نے دو ٹوک کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

"جی میم! آپ کچھ کہہ رہی تھیں شاید؟" وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

"سر! میری مجبوری ہے کہ میں ایک چیز کی عادی ہو جاؤں یا پھر اسے پسند کر لوں تو اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، میں پچھلے دو، تین سال سے ایک ہی رنگ ٹیون یوز کر رہی تھی، مگر کچھ روز پہلے وہ ٹیون میری دوست سے میرے سیل سے ڈیلیٹ ہو گئی، میں نے وہ ٹیون ہر جگہ ڈھونڈی ہے، مگر مجھے نہیں ملی، لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے وہ ٹیون آپ کے سیل پہ بطور رنگ ٹیون سنی ہے۔" زیست نے اس آدمی کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تفصیلی وضاحت دی تھی۔

"تو اب اس کے لیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ کافی سکون سے پوچھ رہا تھا۔

"اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ وہ ٹیون میرے سیل پہ ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں؟" زیست نے اپنا سیل سامنے کیا۔ اس آدمی نے چند سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا، پھر اپنا سیل اٹھا کر زیست کے سامنے رکھ دیا۔

"جو رنگ ٹیون آپ کو پسند ہے آپ خود سینڈ کر لیں۔" زیست اس کی ایسی نوازش پہ خوش اور حیران ہوئی تھی مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

''تھینک یو سر! تھینک یو سو مچ۔'' وہ اس کا شکریہ ادا کر کے سیل اٹھا کو بلیوٹوتھ آن کر کے ٹیون سینڈ کرنے لگی لیکن بلیوٹوتھ پہ اس آدمی کا ری نیم پڑھ کے چونک گئی تھی۔

''آفریدی؟'' اس نے حیرت اور پریشانی سے دوبارہ اس نام کو پڑھا اور پھر اس آدمی کو دوبارہ اک نظر دیکھا، وہ ویٹر کی طرف متوجہ تھا، ویٹر ٹیبل پہ کھانا لگا رہا تھا۔

ویٹر کے رخصت ہوتے ہی اس آدمی نے زیست کی سمت دیکھا، وہ یک دم نظروں کا زاویہ بدل گئی، وہ اپنی پریشانی اس پہ عیاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے رنگ ٹیون سینڈ کرنے کے ساتھ ساتھ اس آدمی کے نمبر سے اپنے نمبر پہ ایک میسج بھی سینڈ کر لیا تھا تاکہ وہ اس کا نمبر تو جان لیتی۔ پانچ منٹ میں اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے سیل واپس اس آدمی کی طرف بڑھا دیا۔

''تھینکس اگین سر!'' وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی لیکن اس آدمی کی نظر اس کی دلکش مسکراہٹ پہ ٹھہری گئی تھی۔

''مکرم خان آفریدی کہتے ہیں مجھے۔'' اس نے کافی مہذب انداز میں اپنا نام بتایا کیونکہ وہ بار بار اسے ''سر'' کہہ رہی تھی۔

''اور مجھے لوگ زیست علی کے نام سے پکارتے ہیں۔'' اس نے بھی جواباً اپنا نام بتایا تھا۔

''ہوں! نائس نیم!'' وہ سراہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

''آپ کا نام بھی آپ کی پرسنالٹی پر کافی سوٹ کرتا ہے۔'' اس نے بھی سچے دل سے تعریف کی تھی۔

''تھینک یو میم!'' وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''اوکے سر، اللہ حافظ!'' وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

مکرم خان آفریدی نے اسے دور تک دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فرینڈز کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اچھی، پراعتماد اور باوقار لڑکی تھی کیونکہ جب وہ اس کے پاس آئی تھی تو اس نے یہی سوچا تھا کہ خوامخواہ گلے پڑنے کی کوشش میں ہے جبکہ اس نے تو مطلب کی بات کے سوا کوئی دوسری بات بھی نہیں کی تھی، آج کل کے لڑکے لڑکیوں کی طرح نہ تو اس نے نمبر مانگا تھا اور نہ ہی اس کا نام پوچھا تھا بلکہ نام بھی اس نے خود ہی بتایا تھا۔ اسی لیے مکرم کو وہ اچھی لگی تھی مگر افسوس کہ دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا اور جیسے ہی وہ کھانا کھانے کے بعد اپنا موبائل اور چابی اٹھاتے ہوئے کرسی سے کھڑا ہوا اس کی نظر ٹھٹک گئی۔ سامنے ہی ہنا لیڈیز والٹ پڑا تھا اور یہی والٹ تھوڑی دیر پہلے اس نے اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

''اوہ نو، وہ لڑکی اپنا والٹ بھول گئی؟''

اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل سے وہ والٹ اٹھایا تھا اور بل پے کر کے تیزی سے باہر نکل آیا۔ لیکن ہر جگہ متلاشی نظروں سے دیکھنے کے باوجود اسے وہ لڑکی کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ افسوس سے والٹ کو دیکھتے ہوئے اپنی گاڑی میں آن بیٹھا۔ اس لڑکی سے رابطے کا کوئی ذریعہ بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

"مان لو زیست صاحبا آپ اپنے پلان میں فیل ہو چکی ہیں اور یہ کہ آپ نے صرف شرط ہی نہیں ہاری، بلکہ اپنا پیسوں سے بھرا والٹ بھی ہار چکی ہیں۔" تین دن گزر جانے کے بعد بھی جب اس آدمی کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا تو ثانیہ وغیرہ نے مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا لیکن زیست اپنی جگہ پہ مطمئن تھی کیونکہ اس کے پاس اس آدمی کا نمبر موجود تھا، وہ جب چاہتی کانٹیکٹ کر سکتی تھی بس ابھی وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ آدمی کب تک کانٹیکٹ نہیں کرتا؟ البتہ دل میں یہ بھی شک تھا کہ وہ والٹ اس آدمی کو ملا بھی ہے یا نہیں؟ ہو سکتا ہے وہ اٹھ کر چلا گیا ہو اور اس نے ٹیبل پہ وہ والٹ دیکھا ہی نہ ہو؟ اگر واقعی ہی ایسا ہوا تھا تو پھر یہ زیست خسارے میں رہ گئی تھی، کیونکہ اس نے والٹ بھولنے والی غلطی کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے والٹ میں اچھی خاصی بھاری رقم چھوڑی تھی اور اس کے علاوہ کچھ کارڈز اور کانٹیکٹ نمبرز بھی تھے پھر بھی اس آدمی نے رابطہ نہیں کیا تھا، کیا وجہ تھی آخر؟ وہ شکل وصورت سے اور اپنی پرسنالٹی سے ایسا تو نہیں لگتا تھا کہ پیسے دیکھ کر بے ایمان ہو جاتا؟"

"کس سوچ میں گم ہو محترمہ! میری مانو تو اپنے والٹ کی رپورٹ درج کرواؤ۔" ثانیہ نے مفید مشورہ دیا اور رمشا وغیرہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھیں۔

"میرا والٹ وہی شخص واپس کرے گا اور بہت جلد واپس کرے گا۔" زیست کا لہجہ پر یقین اور مضبوط تھا۔ وہ چاروں دیکھتی رہ گئیں۔

"کیا خود اسے کال کرو گی؟" ثانیہ کو موقع ملا تھا اس لیے خوب بول رہی تھی۔

"کال بھی وہ خود کرے گا۔"

"اتنا یقین کس بات پہ ہے؟" رمشا نے پوچھا

"اس کا نام جانتی ہو تم؟" زیست نے رمشا کو دیکھ کر استفسار کیا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مکرم خان آفریدی نام ہے، اس کا تعلق پشاور سے ہوگا اور اس لحاظ سے تم جان سکتی ہو کہ میں یہ بات اتنے یقین سے کیوں کہہ رہی ہوں؟" زیست نے بڑے تحمل اور سکون سے بم پھوڑا تھا۔ وہ سب ہی چونک اٹھی تھیں جبکہ سحرش کے چہرے پر پریشانی ہلکورے لینے لگی تھی۔

"مکرم خان آفریدی؟" اسنے زیر لب دہرایا۔

"زیست پاگل ہو گئی ہو؟ تم ابھی بھی اس آدمی سے کانٹیکٹ کرنا چاہ رہی ہو؟" سحرش بول رہی تھی اور ایسی ہی پریشانی رمشا اور ارمین وغیرہ کے چہرے پہ بھی تھی۔

زیست ان کو دیکھ کر مسکرا دی۔ "اوہ او کے یار! وہ اگر آفریدی خاندان کا سپوت ہے تو میں بھی حشمت علی خان کی بیٹی ہوں، ڈر کس بات کا ہے؟" وہ بے پرواہ تھی جبکہ سحرش کے چہرے پہ خوف تھا۔

"اگر تم کہو تو میں اپنی شرط واپس لے لیتی ہوں۔" ثانیہ نے عنایت کرنا چاہی۔

"ہرگز نہیں، میں نے جو کہا ہے، میں کروں گی ضرور، وہ شخص چاہے کوئی بھی ہو۔" زیست پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی اور ثانیہ کو بھی اس سے یہ ہی امید تھی۔ وہ اندر سے دل کھول کے مسکرائی۔

☆☆☆

وہ پچھلے چار دن سے کراچی گیا ہوا تھا۔ آفس کی ایک ڈیل پرابلم کر رہی تھی اس لیے مناسب تھا کہ وہ جا کر فیس ٹو فیس ڈیل لیتا اور اسی چکر میں چار دن لگ گئے تھے۔ واپس آیا تو یہاں بھی آفس توجہ کا منتظر تھا۔ پورا دن آفس میں گزار کر تھکا ہارا گھر آیا تو آتے ہی بیڈ پر گر گیا۔ وہ جینج کیے بنا بیڈ کے بیچوں بیچ چاروں شانے چت لیٹا بے سدھ سویا ہوا تھا۔ آنکھ کھلی تو موبائل فون بج رہا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی موبائل کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!'' اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

''السلام علیکم لالہ سائیں!'' دوسری طرف ارقم تھا۔ مکرم اس کی آواز سن کر مسکرایا۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہو یار؟'' مکرم کا لہجہ محبت اور اپنائیت سے لبریز تھا۔

''میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں؟ اتنے دن ہو گئے آپ گاؤں نہیں آئے؟'' ارقم اداسی سے بولا۔

''یار! ابھی تو کراچی سے آیا ہوں، چار دن لگ گئے وہاں۔'' وہ مکرم سے کافی چھوٹا تھا، ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ''اب دو دن بعد آؤں گا۔''

''کیوں دو دن بعد کیوں؟''

''وہ میں آ کر بتاؤں گا۔'' مکرم کچھ سوچ کر مسکرایا۔

''تو اب گاؤں کا چکر لگا لیں اماں جی اور آغا جی آپ کو مس کر رہے ہیں۔''

''آغا جان کو فون دو، میں ان سے بات کرتا ہوں۔'' مکرم بیڈ سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ایک ہاتھ سے اپنی شرٹ کے بٹن کھولنے لگا، ارقم نے فون آغا جان کو پکڑا دیا تھا۔

''السلام علیکم آغا جان!''

''وعلیکم السلام، کراچی سے کب آئے ہو؟'' وہ بیٹے کی آواز سنتے ہی جیسے جوان ہو اٹھتے تھے، انھیں اپنے دونوں بیٹے بہت عزیز تھے۔ ان کی سوچ اپنے قبیلے کے لوگوں سے کافی مختلف تھی، انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کا رجحان کبھی بھی اپنی خاندانی دشمنیوں کی طرف نہیں ہونے دیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ ان دونوں کو اس چیز سے دور رکھا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ مکرم خان آفریدی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب اپنا ذاتی بزنس چلا رہا تھا، ان کے خاندان اور قبیلوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کی کبھی خبر ہی نہ رکھی تھی۔

''آج ہی آیا ہوں۔ آپ سنائیں، آپ کیسے ہیں اور اماں کہاں ہیں؟''

مکرم کافی دیر ان سے باتیں کرتا رہا۔ آغا جان نے ہی پھر فون بند کیا تھا۔ مکرم شاور لینے باتھ روم میں گھس گیا۔ شاور لینے کے بعد کمرے میں آیا تھا اس کا موبائل متواتر بج رہا تھا اور نہ جانے کیسے اچانک اسے اپنے موبائل کی رنگ ٹیون سن کر دوست کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے کچھ یاد آتے ہی آگے بڑھ کے اپنی سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی، سامنے ہی وہ والٹ رکھا تھا اس نے تیزی سے وہ والٹ باہر نکال لیا۔ اس روز واپس آ کر اس نے یہ والٹ اسی طرح دراز میں ڈال دیا تھا اور دوسرے روز صبح ہی کراچی چلا گیا تھا۔ وہ والٹ کھولتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ والٹ میں اچھی خاصی بھاری

رقم تھی، سارے ہزار، ہزار کے نوٹ تھے۔ اس نے گننے کی زحمت نہیں کی اور والٹ کی دوسری پاکٹ چیک کرنے لگا، ایک چھوٹی سی آٹوگراف بک تھی، دو تین شاپنگ بل تھے، ایک ٹیلر کا کارڈ تھا چار پانچ بلیک کلر کی ہیرپن تھیں، دو موبائل کارڈز تھے جو ابھی اسکریچ نہیں ہوئے تھے ایک چھوٹا سا چیونگم کا پیکٹ تھا، بس اس کے علاوہ تو اور کچھ بھی نہیں تھا، بکرم نے ساری چیزیں چھوڑ کر آٹوگراف بک اٹھائی اور کھول کر پڑھنے لگا، فرسٹ پیج پہ "فرینڈز" لکھا ہوا تھا اس نے اگلا پیج کھولا۔

"زیست علی!" ہوں یہی نام تھا اس کا۔ وہ نام پڑھتے ہی بے ساختہ بڑبڑایا۔

نام کے نیچے اس کی وش اور سیل نمبر لکھا ہوا تھا اس سے اگلے پیج پر سحرش ریاض کا نام۔ اس کی وش اور اس کا نمبر تھا، تیسرا پیج ثانیہ اور چوتھا رمشا کا تھا اور سب سے آخر میں ارمین کا نام درج تھا۔

اس سے آگے چند اشعار درج تھے اور کچھ اوٹ پٹانگ باتیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ آخری عبارت خاصی دلچسپ تھی۔

"یہ نوٹ بک جس کو بھی ملے برائے مہربانی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے ہمیں اس پتے پہ ارسال کر دے، ہم پانچوں کی دعائیں اس کے ساتھ رہیں گی۔"

"ہوں انٹرسٹنگ!" اس نے وہ نوٹ بک بند کی اور پھر اپنے سیل فون کو دیکھنے لگا اور کچھ سوچتے ہوئے زیست کا نمبر ڈائل کر لیا، دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔

"ہیلو!" اس کی آواز کچھ مصروف سی تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ متانت سے بولا۔ اس کی بھاری گمبھیر آواز دوسری طرف کمپیوٹر پہ مصروف زیست کو بری طرح چونکا کے رکھ گئی تھی۔ مصروفیت کے باعث اسنے نمبر دیکھے بنا ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

"آپ کون؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"بکرم خان آفریدی، چند روز پہلے آپ سے ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوئی تھی، آپ کا نام شاید زیست علی ہے؟" وہ پورا تعارف دے رہا تھا۔

"جی..... یاد آ گیا، میں نے آپ سے رونگ نمبر لی تھی۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"میڈم! اگر آپ کو مجھ سے ملاقات یاد ہے تو آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ اس روز آپ کا کچھ نقصان ہوا تھا کوئی چیز گم ہوئی تھی؟" بکرم نے یاد دلایا۔

"جی سر! اچھی طرح یاد ہے، میرا کافی زیادہ نقصان ہوا تھا، میرا والٹ گم ہو گیا تھا، میری مہینے بھر کی پاکٹ منی تھی اس میں۔" اس کا انداز افسوس بھرا تھا۔

"ہوں! لیکن اگر آپ کی پاکٹ منی آپ کو واپس مل جائے تو؟" وہ سسپنس پھیلانے والے انداز سے بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا میرا والٹ آپ کو ملا تھا؟ وہ والٹ آپ کے پاس ہے؟"

جانے کیوں بکرم کا جی چاہا کاش وہ اس وقت اس لڑکی کے چہرے پر پھیلنے والی حیرت اور خوشی کے تاثرات دیکھ سکتا۔

"جی، آپ کا والٹ میرے پاس ہے، اس روز اتفاقاً میری نظر پڑ گئی تھی، لیکن میں آپ سے کانٹیکٹ نہیں کر سکا۔ دراصل کام کے سلسلے میں کراچی چلا گیا تھا آج واپسی پہ آپ کا والٹ یاد آیا ہے تو فوری رابطہ کر لیا۔"

"او تھینک گاڈ، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرا والٹ مجھے واپس مل گیا ہے تھینک یو سر! آپ نے مجھ پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔" وہ مشکور ہونے لگی۔

"اٹس اوکے میم اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ بتائیں آپ کا والٹ کہاں پہنچانا ہوگا؟"

"سر اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ میرا والٹ میرے ہاسٹل پہنچا دیں۔"

"اوکے، میں صبح آفس جانے سے پہلے......"

"نہیں سر! آفس جانے سے پہلے نہیں آفس جانے کے بعد ان فیکٹ مجھے یونیورسٹی کے لیے نکلنا ہوتا ہے صبح صبح، لیٹ ہو جاؤں گی۔" وہ اس کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے بولی تھی۔ "آپ واچ مین سے کہہ دیجئے گا کہ محرش ریاض سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟ آپ کا نام تو غالباً زیست علی......"

"جی سر! میرا نام زیست علی ہے لیکن میرے پاپا اور بھائیوں کے سوا مجھ سے ملنے کی کسی کو بھی پرمیشن نہیں ہے، البتہ محرش میری دوست اور روم میٹ ہے، اس کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ یا پابندی نہیں ہے، آپ بہت سکون سے تشریف لا سکتے ہیں، ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ لڑکیوں کے ہاسٹل جا رہے ہیں۔" اس نے ساتھ ساتھ اسے تسلی دی تھی اور مکرم خان آفریدی بے ساختہ ہنس دیا تھا ہاں مجھے واقعی نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ آپ جو موجود ہیں۔"

"آف کورس، اس میں کوئی شک نہیں، آپ میرے مہمان ہیں، آپ کی عزت و احترام سر آنکھوں پہ۔" لڑکی واقعی کمال کی تھی۔ مکرم خان آفریدی نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پہ مجبور ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد پھر سے شکریہ ادا کرتے ہوئے فون بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"واٹ! تم نے میرا نام لے دیا؟" سحرش کو یک دم کرنٹ چھو گیا تھا۔

"تو اور کس کا لیتی؟ یار مجبوری تھی، تم جاتی تو ہو مجھ سے ملنے کوئی اور نہیں آ سکتا؟" زیست صبح صبح ہی سحرش کو دوبلا رہی تھی۔

"لیکن زیست! تم جانتی ہو اس طرح میری ریپوٹیشن کیا ہو جائے گی؟" سحرش غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا تمہاری ریپوٹیشن کو، اور کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ یہ دیکھتا پھرے کہ وہ آدمی تم سے ملنے آیا ہے یا مجھ سے؟" زیست نے خفگی سے کہا تو سحرش خاموش ہو گئی اب اور کیا کہتی؟ کتنا غصہ کرتی؟ جو ہونا تھا وہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔

پھر جیسے جیسے ثانیہ، رمشا اور ارمین کو کرم خان آفریدی کی کال کا پتا چلا انہوں نے حیرانی کا اظہار کیا تھا جبکہ زیست آج خوش تھی، اسے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی جیت کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھ دیا ہے۔

"کیا اس نے خود کال کی تھی؟" ثانیہ متذبذب تھی۔

"سحرش سے پوچھ لو، جب اس کی کال آئی تو یہ جاگ رہی تھی بعد میں سوئی تھی اور اگر پھر بھی کوئی شک ہے تو تم میرے سیل پر ریسیو کالز چیک کر سکتی ہو۔" زیست کے پاس تمام ثبوت تھے وہ ثانیہ کو لاجواب کر کے واش روم میں چلی گئی، اسے یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے واپسی پہ وہ کھانا کھاتے ہی سو گئی تھی اور یہ تو ان سب کی روٹین تھی، سب ہی یونیورسٹی سے واپس آ کر کھانا کھاتیں اور شام تک کے لیے گہری نیند سو جاتی تھیں۔ مگر آج سب ہی کی نیند ٹوٹی تھی۔

"مس سحرش! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" وارڈن نے کسی ملازمہ کو بلانے بھیجا تھا۔ سحرش گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"اوہ ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" وہ ملازمہ کو بھیج کر زیست پہ چڑھ دوڑی۔

"اٹھو، مرو، آ گیا ہے تمہارا عاشق۔" اس نے زیست کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ زیست بھی ہڑبڑا کر بیدار ہوئی تھی۔

"اوہ گاڈ! مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اس نے آنا ہے۔" زیست سر پہ ہاتھ مارتی فوراً چادر پرے ہٹا کر بیڈ سے اتر گئی۔ انتہائی عجلت میں اپنی نازک سی چپل پہنتی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی، اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کا حلیہ کیا ہے؟

"السلام علیکم!" اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔ کرم آفریدی ٹیبل پہ رکھا اخبار دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی آواز پہ فوراً متوجہ ہوتے ہوئے صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہیں آپ؟" کرم نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے سرتاپا گہری نظر سے دیکھا تھا۔

سفید ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر پہ ریڈ ہاف سلیو ز ٹاپ پہنے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے روبرو کھڑی تھی، سیاہ گھنے گھنگریالے بال اس وقت بکھرے ہوئے تھے اور موٹی موٹی سحر انگیز آنکھیں نیند سے اچانک تعلق ٹوٹنے کا اعلان کر رہی تھیں کیونکہ اس وقت آنکھوں کی گلابیاں اور بوجھل پن عروج پر تھا۔

''قائن سر! آپ سنائیں، کیسے ہیں؟'' وہ اپنا دماغ ٹھکانے لاتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی ورنہ اس طرح اچانک بڑبڑا جانے پر اس کی دھڑکنیں ابھی تک ہموار نہیں ہو پائی تھیں۔

''لگتا ہے میں نے اس وقت آپ کو خاصا ڈسٹرب کیا ہے؟'' مکرم اس کے انداز کی سستی بھانپ چکا تھا۔ اور وہ اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''نہیں سر! ڈسٹربنس کیسی؟ بلکہ ڈسٹرب تو آپ ہوئے ہیں، آپ کو میری وجہ سے اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی ہوئی بالوں کو ایک سائیڈ پہ ڈال چکی تھی، مکرم آفریدی کی نظریں پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس طرح بے اختیار ہو رہی تھیں۔

''آپ کراچی کیوں گئے تھے؟'' زیست اس کی نظروں کی محویت محسوس کرتے ہوئے اس کا تسلسل توڑنے کے لیے بولی تھی۔

''آفس کے کام سے گیا تھا۔'' وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا۔ زیست اپنے بال دوبارہ دونوں شانوں پہ ڈال چکی تھی۔

''آپ اکیلے کام کرتے ہیں؟'' وہ جان بوجھ کر ادھر ادھر کے سوال کر رہی تھی تاکہ ملاقات کو طول دیا جا سکے۔

''میرا ذاتی بزنس ہے کسی کے ساتھ کوئی پارٹنر شپ نہیں ہے اس لیے زیادہ کام خود ہی سنبھالنا پڑتا ہے۔''

''اور آپ کی فیملی؟'' وہ رفتہ رفتہ سوالات بڑھا رہی تھی۔

''میرا تعلق پشاور سے ہے، کافی بڑی فیملی ہے ہماری، البتہ ہم لوگ دو بھائی اور دو بہنیں ہیں، بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں میرے والد محترم جن کو ہم سب ''آغا جان'' کہتے ہیں وہ خاندانی دشمنیاں نبھاتے پھر رہے ہیں، والدہ محترمہ نے گھر سنبھال رکھا ہے، چھوٹا بھائی نائنتھ کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے اور میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

زیست بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ ''یعنی آپ ابھی آزاد پھر رہے ہیں؟ آپ کسی خان زادی کے پلے سے نہیں بندھے؟'' وہ چھیڑ رہی تھی۔

''اور ایسا ہوگا بھی نہیں میں کسی خان زادی کے پلے سے نہیں بندھ سکتا، میری سوچ، میرے خیالات اپنے علاقے کے لوگوں سے مختلف ہیں، میں وہیں پیدا ہو کر وہیں کسی کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ کر اپنے قتل کا ارادہ رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں، میرے لیے میری تعلیم، میرا بزنس، میرا آزادانہ لائف اسٹائل ہی سب کچھ ہے، میں قبیلوں کے فیصلوں سے ہٹ کر ایک آزاد اور خود مختار زندگی جینا چاہتا ہوں اور اس کا حق مجھے میرے بابا جان نے دیا ہے۔''

مکرم آفریدی کی باتیں زیست کو اندر سے حیران بھی کر رہی تھیں اور متاثر بھی۔

''ایک وے یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، آپ بتائیں کیا لیں گے؟'' زیست نے سر جھٹک کر ٹاپک بدلا۔

''نو تھینکس میم! میں خاصا لیٹ ہو چکا ہوں، میں نے آج تھوڑی شاپنگ کے لیے جانا تھا، بس آپ کا والٹ پہنچانے کی جلدی تھی اس لیے سیدھا اس طرف ہی آ گیا۔''

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جیب سے والٹ نکال کر زیست کی سمت بڑھا دیا۔

"تھینک یو سر! لیکن آپ کی چائے مجھ پر ادھار رہی، آپ جب چاہیں میں آپ کو چائے ضرور پلاؤں گی۔" وہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئی تھی۔

"میں آپ کو ایسی زحمت ضرور دوں گا، یہ میرا کارڈ ہے، آپ کو کوئی بھی ضرورت ہو، مجھ سے کانٹیکٹ کر سکتی ہیں۔" وہ اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"اور اگر کوئی بھی ضرورت نہ ہو تو؟" زیست نے کارڈ تھامتے ہوئے جس لہجے اور انداز میں کہا وہ مجھ کر خوش دلی سے مسکرا دیا۔

"تو بھی آپ مجھ سے کانٹیکٹ کر سکتی ہیں بلکہ میں انتظار کروں گا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا اور پھر خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

شام کے سائے ڈھل چکے تھے، زیست ہاتھ میں پکڑا والٹ اور اس کا کارڈ دیکھتی ہوئی اندر آ گئی۔

"آئی ایم سوری مکرم خان آفریدی! تم حقیقتاً ایک اچھے انسان ہو، مگر تم کو بے وقوف بنانا میری مجبوری ہے۔" وہ دل ہی دل میں افسوس کا اظہار کرتی اندر آ گئی۔

☆☆☆

"آغا جان! مکرم لالا آ گئے۔" ارقم حویلی کی چھت پہ کھڑا کبوتروں کی اڑان دیکھ رہا تھا جب اس نے حویلی کی طرف آنے والی سڑک پہ مکرم خان آفریدی کی لینڈ کروزر دیکھی تھی اور وہ باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے نیچے بھاگا آیا تھا۔ خان صاحب مردان خانے میں تھے، ساتھ والے گاؤں سے کچھ لوگ اور گاؤں کے سردار صاحب آئے ہوئے تھے، خاصا گھمبیر مسئلہ تھا، شاید اسی لیے باہمی مشورے سے کچھ طے کرنا چاہ رہے تھے لیکن ارقم کی آمد اور شور نے ان کی بات میں خلل ڈال دیا تھا، اب نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا دھیان مکرم کی طرف ہو چکا تھا۔

ارقم مردان خانے سے نکل کر حویلی کی روش پہ آ کھڑا ہوا، اس کے گاڑی سے اترتے ہی وہ بھاگ کے مکرم کے سینے سے جا لگا تھا۔

"کیسے ہو یار؟" وہ اس کے بال بکھیرتے ہوئے بولا۔

"فٹ اینڈ فائن۔" وہ چہک کے بولا، مکرم مسکرا دیا۔

"آغا جان کہاں ہیں؟"

"مردان خانے میں۔" ارقم نے اشارہ کیا۔

"اچھا میں ان سے مل لوں، تم روشن خان سے کہو گاڑی سے سامان اتار کر میرے کمرے میں رکھ آئے۔" اس نے پلٹ کر ہدایت دی اور ارقم سعادت مندی سے سر ہلاتا روشن خان کو بلانے چل دیا۔

"السلام علیکم؟" اس نے مردان خانے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" آغا جان بیٹے کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے دونوں باپ بیٹا بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے پھر وہ ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

"بیٹا! ان سے ملو یہ ساتھ والے گاؤں کے سردار خورشید خان ہیں اور یہ ان کے بیٹے ہیں گلباز خان اور گریز خان۔"

انہوں نے بیٹے کو بتایا وہ سب سے انجان اور ناواقف ہوتے ہوئے بھی ان لوگوں سے کافی عزت احترام سے مل رہا تھا۔

"ماشاءاللہ نواب خان! تمہارا بیٹا تو وجاہت میں تم سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔" سردار خورشید خان، مکرم کو دیکھ کر سراہے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

مکرم بچپن سے لے کر اب تک زیادہ وقت شہر میں ہی رہا تھا، اس لیے آس پاس کے علاقے والوں سے ذرا کم ہی ملاقات ہوتی تھی، سردار خورشید خان نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"اولاد ہمیشہ ہی چار ہاتھ آگے ہوتی ہے۔" آغا جان، مکرم کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائے۔ ان کے انداز میں فخر تھا۔

"لیکن تم نے اسے اپنے قبیلے سے دور کیوں کر رکھا ہے، اپنے پرائے کی پہچان ہی نہیں ہے۔" انہیں اعتراض ہوا تھا۔

"اچھا ہے نا اسے کسی کی پہچان نہیں ہے یا تو سب کو اپنا سمجھے گا یا سب کو پرایا اور قبیلے میں سوائے دشمنیوں اور قتل وغارت کے اور رکھا بھی کیا ہے؟ میری خواہش تھی کہ قبیلے کے رسم و روایات سے ہٹ کے میرے بچے پڑھے لکھے ہوں اور ایک سکون کی زندگی گزاریں، بیٹیوں کو چودہ جماعتیں پڑھا کر ان کے گھر بار کا کر دیا ہے، بیٹا پڑھ لکھ کر اپنا بزنس کر رہا ہے، چھوٹا بیٹا ابھی پڑھ رہا ہے، ان خاندانی دشمنیوں اور جھمیلوں کے لیے میں ہی کافی ہوں۔" آغا جان اپنی جگہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔

"یعنی تمہارے بعد تمہارا خاندانی نظام ٹھپ ہو کے رہ جائے گا؟ تمہارے بیٹے نہ تو تمہاری دشمنی نبھا سکیں گے اور نہ تمہارا نام چلا سکیں گے جو کچھ بھی ہے وہ بس تمہاری زندگی تک ہے۔"

سردار خورشید خان کی بات نواب خان آفریدی کو خاصی بری طرح چبھی تھی، مکرم نے بھی چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ اس نے سردار خورشید خان کو جواب دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ آغا جان نے منع کر دیا وہ ان کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ کر چپ ہو گیا تھا۔

"سردار! مجھے پتا ہے میرے بیٹے میرا نام کس حد تک چلا سکتے ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ بحث قبل از وقت ہے زندگی رہی تو دیکھیے گا میرے بیٹے میرا کتنا نام روشن کرتے ہیں۔ جاؤ بیٹا! تھکے ہوئے آئے ہو آرام کرو، ماں اور دادی سے ملو، انتظار کر رہی ہوں گی۔" خان صاحب نے تحمل سے کہا، مکرم اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔

☆☆☆

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے ٹو مائی لولی برادر!" ارقم سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا رہا تھا جب ملازمہ نے بتایا کہ مکرم صاحب اسے اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں اور جیسے ہی وہ مکرم کے کمرے میں داخل ہوا، کینڈل کی روشنی میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ اسے وش کیا جا رہا تھا اور ارقم خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا تھا۔

"لالہ سائیں! آپ کو میرا برتھ ڈے یاد تھا؟" وہ بے حد خوش ہو رہا تھا۔

"تو کیا یہ بھولنے والا دن ہے؟" مکرم اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آیا تھا، خان صاحب، اماں سائیں، دادی، چاچو، چاچی اور باقی کزنز

کے ساتھ ساتھ اس کی بہن اور بہنوئی بھی مکرم کے کمرے میں جمع تھے۔ درمیانی میز پہ بڑا سا کیک رکھا تھا مکرم یہ کیک اسلام آباد سے باقاعدہ آرڈر پہ بنوا کر لایا تھا۔

"یہ رہا تمہارا گفٹ۔" اس نے خوب صورت ریپر میں پیک گفٹ اس کی سمت بڑھایا۔

"یہ وجہ تھی دو دن بعد آنے کی تم اسی روز آنے کا اصرار کر رہے تھے۔" مکرم نے جس محبت سے اسے بتایا ارقم اور بھی خوش ہوا اور مکرم سے لپٹ گیا تھا۔

"تھینک یو لالہ سائیں، تھینک یو سو مچ۔"

"اب اپنے لالے کا ہی شکریہ ادا کرتے رہو گے یا ہم سے بھی گفٹ لو گے؟" آغا جان نے مداخلت کی۔

سب ہی نے باری باری اسے گفٹس دیے تھے، مکرم نے اپنے آنے سے پہلے ہی آغا جان کو بتا دیا تھا کہ وہ تھوڑی بہت تیاری کروا دیں، لیکن ارقم کو پتا نہ چلے اور آج ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

چھٹیاں ہو چکی تھیں، سحرش اور تانیہ دونوں اپنے اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، بس چند ایک لڑکیاں ہی موجود تھیں، شاید وہ جن کا گھر میں کوئی بھی انتظار کرنے والا نہیں تھا، بالکل زیست کی طرح، جس کے اپنے تو تھے مگر انہوں کو اس کا انتظار نہیں تھا اور اگر وہ خود ہی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے چلی جاتی تو بھی وہ اسے دیکھ کر رخ موڑ لیتے، اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ ہاسٹل میں ہی چھٹیاں گزار لیتی۔

سو اس خالی بھاں بھاں کرتے ہاسٹل میں پھرتے ہوئے آج بوریت سے تنگ آ کر وہ گاڑی لے کر سڑکوں پہ نکل آئی تھی بہت سے شاپنگ مال اور بہت سی سڑکیں اس نے بے مقصد ہی چھان ڈالی تھیں، لیکن پھر بھی دل بجھا بجھا سا تھا۔ اس کا دل اپنے بابا سے ملنے کو چاہ رہا تھا، لیکن اتنے دن ہو گئے تھے، وہ اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ بس فون پہ بات ہوتی تو اسے تسلی دلاسا دینے لگتے تھے اور وہ چپ ہو جاتی اور اس کی یہی چپ اس کے اپنے ہی دل میں دکھ کا زہر بھرنے لگی تھی، ابھی بھی وہ لب بھینچے ڈرائیو کر رہی تھی اور کچھ خبر نہیں تھی کہ کن راستوں پہ جا رہی ہے؟ بس وہ خاموشی سے مختلف سڑکوں پہ آوارہ گردی کرتے ہوئے دل بہلاتی پھر رہی تھی اور جب بری طرح تھک گئی تو اچانک سڑک کنارے بریک لگا دیے تھے اور اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر پلکیں موند لی تھیں۔

اس وقت اگر حشمت علی خان دیکھ لیتے کہ تنہائی اور اداسی میں ان کی بیٹی کا کیا حال ہوتا ہے تو یقیناً کبھی بھی اسے تنہا نہ چھوڑتے، اپنی لاڈلی بیٹی کو ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے سینے سے لگا کر رکھتے، اس کی بند آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے مگر وہ آنسوؤں کو شہ نہیں دینا چاہتی تھی اسے سختی سے تمام آنسو واپس دل کے دریا میں ڈال دیے تھے اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

"دل اداس ہو تو دوستوں سے ملنا چاہیے۔" مکرم خان عین اس کی گاڑی کے قریب آ کر بولا تھا اور زیست نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ کچھ ہی دور اس کی گاڑی بھی کھڑی تھی وہ یقیناً اسے دیکھ کر ہی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

''مجھے اپنے دکھ دوسروں کے سامنے رونا اچھا نہیں لگتا۔'' وہ اپنے لہجے کی نمی پہ کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

''امیزنگ میں ایسا جملہ پہلی بار کسی لڑکی کے منہ سے سن رہا ہوں۔''

''لیکن مجھے رونا اچھا نہیں لگتا، کیونکہ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''عورت کے آنسوؤں میں بہت طاقت ہوتی ہے، سخت سے سخت دل بھی نرم ہو جاتا ہے۔'' کرم دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

''آپ کے دل پہ آج تک کسی عورت کے آنسوؤں نے اثر کیا ہے؟'' وہ گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو میرے دل پہ کسی عورت کی آنکھوں نے اثر کیا ہے، دیکھتے ہیں آنسو کتنا اثر کریں گے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا دوسرے ہی پل نظروں کا زاویہ بدل گیا۔

''اگر آپ کو یاد ہو تو میری چائے ادھار تھی آپ کی طرف۔'' وہ بات بدل کر بولا تھا۔

''جی یاد ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''تو پھر کب پلا رہی ہیں چائے؟''

''جب آپ کہیں۔'' وہ آہستہ سے مسکرائی۔

''ابھی!'' کرم نے گھڑی دیکھی شام کے چار بجے کا وقت تھا، کسی بھی ریسٹورنٹ یا کیفے پہنچتے ہوئے یقیناً پانچ بج جاتے۔

''لیکن ابھی میرا......''

''دیکھیے میڈم! آپ نے فیصلہ میری مرضی پہ چھوڑا تھا، اب آپ لیکن ویکن کریں گی تو یہ آپ کی وعدہ خلافی ہو گی۔''

اس نے زیست کے انکار کے باوجود گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نیچے اتر آئی تھی۔

''لیکن میری گاڑی؟''

''آپ کی گاڑی میرا ڈرائیور ہاسٹل پہنچا آئے گا، آپ بے فکر رہیں۔'' وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اطمینان سے بولا اور زیست چپ چپ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی حالانکہ اسے کرم خان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا اور تنہا سفر کرنا اندر سے عجیب بھی لگا تھا۔

''کیا میرے ساتھ میری گاڑی میں سفر کرنا اچھا نہیں لگ رہا؟'' کرم خان اس کی خاموشی توڑ کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔'' اس نے اپنی کنپٹی پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں؟'' اس نے فوراً کہا لیکن زیست نے انکار کر دیا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں، خود بہ خود ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''آپ چھٹیوں پہ گھر کیوں نہیں گئیں؟'' کرم کا سوال سرسری سا تھا۔

''بس دل نہیں چاہا، تنہائی انجوائے کرنے کا موڈ ہو رہا تھا۔'' زیست کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتے ہوئے بولی۔

''گویا میں نے آپ کی تنہائی میں خلل ڈال دیا؟''

''نہیں، آپ سے ملنا اچھا لگ رہا ہے۔'' زیست نے کہا تو وہ مسکرایا۔

''اس بات کو میں حقیقت سمجھوں یا محض ایک مروت؟'' اس نے گردن موڑ کر اپنے برابر بیٹھی زیست کو دیکھا جو اب سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی۔

''کیا میں آپ کو مروت نبھانے والی لگتی ہوں؟''

''میں نے تو یہی سنا ہے کہ جو جیسا لگتا ہے وہ ویسا ہوتا نہیں ہے۔'' کرم اسے تنگ کرنے کے لیے بولا۔

''تو ٹھیک ہے آپ مجھے ویسی سمجھ لیں جیسی آپ سوچتے ہیں۔'' اسنے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ وہ بے ساختہ مسکرایا اور ریسٹورنٹ پہنچنے تک وہ زیست کا موڈ بالکل فریش اور پہلے جیسی حالت میں لانے میں کامیاب ہو چکا تھا جیسے ہی گاڑی پارکنگ میں رکی، کرم خود گاڑی سے اتر کر اس کی سائیڈ پہ آیا اور دروازہ کھول دیا۔

وہ نیچے اتر آئی تھی، شام گہری ہو رہی تھی۔ زیست کو واپس جانے کا خیال بھی دامن گیر تھا مگر اب وہ جلدی بھی تو نہیں جا سکتی تھی۔

☆☆☆

اس شام ان کی ملاقات تکلف، جھجک اور اجنبیت کی آخری ملاقات تھی۔ اب ان دونوں کے درمیان بے تکلف دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ کرم اپنے قدموں کو زیست کی طرف بڑھنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی، کنٹرول کرنے کی بارہا کوشش بھی کی تھی مگر پھر بھی اس نے اپنے آپ کو بے اختیار و بے بس پایا تھا وہ جان چکا تھا کہ اس کے قدم اک ایسی راہ کے مسافر ہو چکے ہیں جہاں سے واپس پلٹ کر آنا ہمیشہ ہی ناممکن ٹھہراتا تھا لیکن اس نے یہ بات ابھی تک زیست پہ ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ وہ اس کے سامنے بہت ہی نارمل اور لاپرواسا بن کے رہتا تھا یوں جیسے وہ اسے صرف دوست کا ہی درجہ دیتا ہو، حالانکہ اس کا دل تو کسی اور جذبے کے ہاتھوں مغلوب ہو چکا تھا جس کو فی الحال پوشیدہ رکھنا ہی بہتر تھا اور وہ اس کے لیے حتی الامکان کوششیں کرتا تھا مگر کبھی کبھی کوششیں بے سود بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے انداز و اطوار سے آغا جان کئی دنوں سے مشکوک ہو رہے تھے لیکن کہا نہیں تھا.....!

☆☆☆

''میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔ تم بس تیار رہو۔'' موبائل پہ کرم خان آفریدی کا میسج دیکھ کر زیست بیڈ سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''او کے، میں تیار ہو رہی ہوں۔'' اس نے اسے جواب دیتے ہوئے گہری سانس کھینچی اور موبائل بیڈ پہ ڈال کے کپڑے چینج کرنے کے لیے اٹھ گئی تھی وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو ملازمہ انتظار میں کھڑی تھی۔ زیست سمجھ گئی کہ کرم آ چکا ہے اسی لیے اس نے ملازمہ کو اشارہ کیا۔

''تم جاؤ میں آ رہی ہوں۔''

''جی بی بی!'' ملازمہ سر ہلا کر پلٹ گئی اور زیست تیار ہو کر جب نیچے ڈرائنگ روم میں آئی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے اور ذہن میں آنے

والی پہلی سوچ نے ہی رنگت متغیر کر ڈالی تھی اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا سامنے اس کے بڑے بھائی راغب علی خٹک اپنے جارحانہ تیوروں سمیت صوفے پر براجمان تھے اور ساتھ ان کے دو گن مین بھی تھے۔

"السلام علیکم لالہ جی!" یہ اس کی بدحواسی ہی تھی کہ وہ آج پہلی بار انہیں "لالہ جی" کہہ رہی تھی ورنہ وہ ہمیشہ انہیں بھائی ہی کہتی تھی۔

"وعلیکم السلام، کہاں تھیں اتنی دیر سے؟ ہم کب سے بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔" ان کے لہجے کی سختی ہمیشہ کی طرح نمایاں تھی۔

"وہ..... ہم..... میں شاور لے رہی تھی، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ آئے ہیں۔" زیست کبھی بھی اس طرح گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہوئی تھی وہ ہمیشہ پُرسکون ہی ہوجاتا، بے خوف و خطر رہتی تھی مگر آج مکرم کی آمد کا سوچ کر ہی اسے کپکپی سی ہوتی تھی۔ ایک ہی علاقے کی دو مختلف پارٹیوں کے لوگ ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاتے تو قیامت کس پا آئی تھی؟ زیست کو کھڑے کھڑے اپنا سینہ چھلنی ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے یکدم جھرجھری سی لے کر سر جھٹک دیا تھا۔

"یا اللہ مکرم خان کو روک لے۔" وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔

"کھڑی کیوں ہو؟" وہ اسے ایک ہی جگہ کھڑے دیکھ کر حیرت سے بولے تھے۔

"اوہ سوری۔ آپ سنائیں بابا کیسے ہیں؟ وہ اتنے دنوں سے شہر کیوں نہیں آئے؟" وہ آگے بڑھ کر صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اتنے فارغ نہیں ہیں کہ روز روز شہر کے چکر لگاتے پھریں۔ وہاں گاؤں اور قبیلے کے سو جھنجھٹ نبھانے ہوتے ہیں انہوں نے۔"

"میں ان کی آمد کی منتظر رہتی ہوں، ہر ماہ وہ میرے لیے رقم تو بھیج دیتے ہیں مگر خود نہیں آتے۔ پہلے تو میرے حویلی جانے پہ پابندی تھی، کیا اب ان کے شہر آنے پہ بھی پابندی ہے؟" زیست نے سارا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ بات تمہیں خود پتا ہونی چاہیے خیر ہم تھوڑا جلدی میں ہیں، بابا نے کہا تھا تم سے ملتے ہوئے آئیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"ہاں میں جانتی ہوں آپ بابا کے کہنے پہ ہی آتے ہیں۔" وہ افسردگی سے کہتے ہوئے مسکرائی۔

"یہ بابا نے دیا تھا۔" انہوں نے خاکی لفافہ اس کی سمت بڑھایا جو خاصا پھولا ہوا تھا۔

"بابا سے کہیے گا جب وہ خود آئیں تب یہ بھی لے لوں گی۔"

"وہ تمہارے ملازم نہیں ہیں۔" راغب علی کو غصہ آیا تھا۔

"وہ میرے والد تو ہیں ناں؟" اس نے ان کو جتا کر کہا تھا۔

"تم ہم سے منہ لگا رہی ہو؟"

اس کی لاپروائی اور بے نیازی پر راغب علی خٹک مٹھی بھینچ کر رہ گئے تھے۔ واپس جاتے ہوئے انہوں نے اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔ زیست وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"خیریت؟ کیا ہوا تمہارے بھائی بڑے غصے میں گئے ہیں؟" رمشا اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"وہ ہمیشہ غصے میں ہی ہوتے ہیں، ڈونٹ وری۔" زیست نے سر جھٹک کر موبائل دیکھا جس پہ مکرم خان کا میسج تھا وہ باہر گیٹ پہ آ چکا تھا۔

''ٹھیک کا ڈبہ پہلے نہیں آیا۔'' اس نے شکر ادا کیا۔

''کون؟''

''مکرم آفریدی۔'' وہ کہہ کر باہر نکل آئی۔ مکرم اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے انتظار کر رہا تھا۔

''آپ اسموکنگ نہیں کرتے؟'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوال کیا۔

''نہیں، کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

''جس طرح آپ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے میں نے اکثر دیکھا ہے لڑکے اس طرح کھڑے جب انتظار کر رہے ہوتے ہیں تو ساتھ ساتھ سگریٹ پھونک رہے ہوتے ہیں جیسے بہت ہی شاہانہ سا اسٹائل جھاڑ رہے ہوں۔ حالانکہ میری نظر میں وہ خاصے چغد لگ رہے ہوتے ہیں۔''

اس کی بات پہ مکرم یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔ ''یعنی میں اس وقت چغد بننے سے بچ گیا ہوں؟''

''اس وقت سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا آپ واقعی اسموکنگ کرتے ہیں؟'' زیست نے حیرت سے مکرم کو دیکھا۔

''کیوں کیا مجھے اسموکنگ نہیں کرنی چاہیے؟'' مکرم کا لہجہ معنی خیز تھا۔ زیست ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''زیست! میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟''

''میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں آپ کی اپنی مرضی ہے اسموکنگ کریں یا نسوار رکھیں، مجھے کیا پرابلم ہے بھلا؟'' اس کے انداز پہ وہ اور بھی زور سے ہنسا تھا۔

''نسوار۔ وہ کیا چیز ہے؟ کبھی دیکھی ہے تم نے۔''

''نہیں جناب! یہ آپ کے ہی علاقے کا تحفہ ہے آپ کو ہی مبارک ہو!'' زیست چڑ کر بولی تھی اسے مکرم کا چھیڑنا اور دل کھول کے ہنسنا غصہ دلا رہا تھا۔

''کبھی آپ کو اپنے علاقے میں لے کر گیا تو آپ کو پہلا تحفہ نسوار ہی دوں گا۔'' اس نے زیست کو چھیڑا۔

''اور ساتھ میں چرس سے بھرا ہوا ایک سگریٹ بھی دیجئے گا۔''

''اوہ خدایا۔ میں بالکل بھی نہیں جانتا تھا کہ آپ نشے کی عادی ہیں۔'' مکرم نے جس انداز میں حیرانی ظاہر کی تھی زیست بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اتنی خوب صورت تھی کہ مکرم کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

''زیست!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

''ہوں؟'' وہ اس کے لہجے پہ چونکی۔

''کچھ نہیں۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ زیست منتظر رہ گئی۔

☆☆☆

"کہاں تک پہنچی تمہاری لو اسٹوری؟" وہ پانچوں پریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد کلاس روم سے نکل کر سیدھی کینٹین آئی تھیں اور اپنی اپنی چیئرز سنبھالنے کے بعد ثانیہ نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

"ماشاءاللہ، میری لو اسٹوری پورے جوبن پہ ہے۔" وہ اک ادا سے بولی تھی۔

"جوبن اترے گا کب؟" ثانیہ نے کھوجتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اللہ نہ کرے کہ کبھی جوبن اترے۔" زیست نے خفگی ظاہر کی۔

"میری جان جوبن ہوتا ہی اترنے کے لیے ہے۔" ثانیہ نے اسے کچھ جتایا۔

"لیکن یار! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" زیست حقیقتاً اپنی لو اسٹوری کا اتنی جلدی بریک اپ نہیں چاہتی تھی۔

"جلدی؟ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ابھی طرف سے دیر ہے وہ تمہارے ساتھ محض دوستی انجوائے کر رہا ہے تمہیں کبھی بھی پرپوز نہیں کرے گا کیونکہ تمہیں خود پتا ہوگا کہ تمہارے علاقے کے مرد شہری انداز و اطوار کی لڑکیوں کو بیوی کے روپ میں پسند نہیں کرتے۔" ثانیہ نے تمسخر سے کہا۔

"لیکن بکرم خان میرے علاقے کے تمام مردوں سے مختلف ہے اس کی سوچ آزاد ہے۔" زیست نے یقین سے رائے دی تھی۔

"ہاں ایسے مردوں کی سوچ آزاد ہوتی ہے مگر صرف شہری حدود تک۔" ثانیہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"لیکن بکرم کی سوچ محدود نہیں ہے اس کی سوچ شہر اور گاؤں دونوں کے لیے یکساں ہے۔" زیست اپنے کہے پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"اچھا اتنا جاننے لگی ہو اسے؟" اس کے لہجے کا تمسخر ہنوز تھا۔

"یار! کسی کو جاننے کے لیے تو ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔"

"جبکہ تم تو اس کے ساتھ کافی وقت گزار چکی ہو؟" ثانیہ نے اس کا جملہ مکمل کیا لیکن زیست نے اس کی بات سرسری سی لی تھی۔

"آف کورس، اس میں کوئی شک نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"تم لوگ اپنی بحث میں پڑی رہو، ہم تو اپنی پیٹ پوجا کرلیں۔" رمشا اور ارمین نے برگر اور گولڈ ڈرنک اپنے سامنے ٹیبل پہ سیٹ کرتے رکھتے ہوئے کہا۔

"احسان اعظم کا کیا بنا؟ کوئی سامنا، کوئی ملاقات ہوئی؟" زیست برگر کھاتے ہوئے بولی، رمشا چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

"ہونہہ، میں زیست علی نہیں ہوں جس کی طرف کوئی بھی متوجہ ہو جائے میں بہت ہی عام سی لڑکی ہوں۔" رمشا نے چڑ کر کہا۔

"بات عام یا خاص کی نہیں ہے۔"

"بات جو بھی ہے زیست! میں اب دل کو جلانا چھوڑ رہی ہوں۔ بس اور نہیں بھاگ سکتی۔" رمشا نے جیسے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

☆☆☆

زیست یونیورسٹی کے گیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی کی سمت بڑھ رہی تھی جب اس کے قدم کسی احساس کے تحت تھم گئے تھے۔ اس نے یکدم پلٹ کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر اچانک حیرت اور بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔

"بابا!" وہ بے اختیار بھاگ کے ان کے قریب آئی تھی۔ وہ بڑے پیار اور بڑے شوق سے دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے گن مین، ڈرائیور اور ان کا خاص ملازم بھی تھا۔ انہوں نے بازو پھیلا کر زیست کو سینے میں بھینچ لیا تھا۔

"میرا بچہ، میری جان، کیسا ہے۔" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"میں ٹھیک ہوں بابا! آپ کیسے ہیں؟ اتنے دن مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟ میں ہر ویک اینڈ پر انتظار کرتی رہی۔" زیست نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا تھا۔

"پتر! تمہیں پتہ ہے تمہارا بابا تم سے اتنے دن دور نہیں رہ سکتا۔ بس تھوڑا بیمار پڑ گیا تھا اس لیے سفر نہیں کیا کہ تھکن ہو جاتی ہے۔ اور تمہارے بہن بھائی بھی منع کرتے تھے کہ بابا سفر سے پرہیز کریں، کوئی نہ کوئی روک لیتا تھا اس لیے نہیں۔" حشمت علی خان اسے سمجھا رہے تھے۔

"میرے بہن بھائی......؟" وہ آہستگی سے بڑبڑائی اور حشمت علی خان چپ سے ہو گئے وہ زیست کی کیفیت سمجھتے تھے۔

"اب آپ کتنے دن کے لیے آئے ہیں۔ ایک دن یا ایک رات؟" اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"ہم تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں۔ چند دن ہمارے ساتھ حویلی چلو، ہمارے سامنے رہو تا کہ ہمیں تسلی تو ہو۔" انہوں نے اس کا سر تھپکا۔

"میں حویلی تو چلوں لیکن آپ کے بیوی بچوں کو تکلیف ہوگی وہ پھر سے تنگ ہوں گے؟"

"ہونے دو۔ جتنا ان کا مجھ پر اور حویلی پر حق ہے اتنا ہی تمہارا بھی ہے۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟" سر جھٹک کر بولے۔

"ڈر تو خیر مجھے کسی کا بھی نہیں ہے بلکہ وہ لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں ان کو لگتا ہے جیسے میں ان سے حویلی چھیننے آ گئی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے ذرا سا ہنسی تھی۔

"تو پھر چلو، ان کو ڈرانے کے لیے ہی چلو۔" وہ بھی مسکرا دیے تھے۔

"السلام علیکم انکل!" ثانیہ، سحرش، ارمین اور رمشا چاروں اکٹھی ان کو دیکھ کر ان کی طرف ہی آ گئی تھیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا، کیسی ہو آپ؟" انہوں نے باری باری ان کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"اللہ کا شکر ہے انکل! سب ٹھیک ہیں۔"

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ زیست ان کے بازو سے لگی کھڑی تھی۔

"یہ تو آپ زیست سے پوچھیں۔ وہ ہم سب سے لائق اور ذہین ہے۔" سحرش نے مسکرا کر کہا۔

"یعنی آپ ذہین نہیں ہو؟" حشمت علی خان مسکرائے تھے۔

"انکل! میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ خفگی سے بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیے تھے اور زیست بھی باقی سب کی طرح اپنی ہنسی نہیں روک پائی تھی۔

''زیست ہاسٹل نہیں چلنا؟'' انہوں نے زیست کو اطمینان سے کھڑے دیکھ کر پوچھا تو وہ اپنے بابا کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تم ان کے ساتھ ہاسٹل جاؤ ہم تھوڑی دیر تک ایک کام نپٹا کر آجاتے ہیں۔'' انہوں نے اس کا کندھا تھپکا اور زیست سر ہلا کر ان کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے، انکل کیا کہہ رہے تھے؟'' سحرش نے پوچھا۔

''میں گاؤں جا رہی ہوں۔'' زیست نے گاڑی روڈ پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہیں؟ یوں اچانک کیوں؟'' انہیں اچنبھا ہوا۔

''بس بابا خود لینے آئے ہیں تو انکار تو نہیں کر سکتی نا؟'' اس نے کندھے اچکا کر کہا۔

''اپنے بے وقوف کو کیا کہو گی؟ اس سے ملے بغیر چلی جاؤ گی؟'' ثانیہ نے جس انداز سے کہا زیست خوب سمجھتی تھی مگر وہ ایسی باتوں سے ٹیمپر لوز کرنے والی بھی نہیں تھی۔

''میرا بے وقوف میرا انتظار کرے گا تو اس کی بے قراری اور بڑھے گی اس کی تڑپ میں اضافہ ہوگا۔''

وہ بڑے پرلطف انداز سے کہہ کر مسکرا رہی تھی اور ثانیہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ زیست اکثر مکرم خان آفریدی کے معاملے میں ان کی بولتی بند کر ڈالتی تھی۔

☆☆☆

حاکم علی خان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ حشمت علی خان دونوں بہن بھائی سے بڑے تھے۔ حشمت علی خان اور ان کی بہن خرسند بچپن سے ہی اپنی پھوپھی کے بچوں سے منسوب تھے۔ خرسند اپنے منگیتر کو بچپن سے چاہتی تھی جبکہ حشمت علی خان کو اپنی منگیتر زہرہ سے بلاوجہ کی چڑ تھی وہ اسے ذرا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس سے شادی کا کوئی ارادہ رکھتے تھے شاید اس لیے بھی کہ انہیں اپنی کلاس فیلو فاطمہ پسند تھی اور وہ اس کے لیے اپنے دل میں محبت کا جذبہ محسوس کرتے تھے لیکن ان کا یہ جذبہ ایسا تھا کہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں رہ سکا تھا اور اس کی خبر فاطمہ کو بھی ہو گئی تھی اس نے خود حشمت علی کے پاس آ کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس سے اظہار محبت کرنے کھڑے ہو گئے تھے۔ فاطمہ نے بار بار روکا اور دامن بچانے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ دیر محبت کی آنچ سے دور نہ رہ سکی اور ان کی محبت کا دم بھرنے لگی۔

یوں ان دونوں کے عشق کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور یوں خبر گھر والوں تک پہنچ گئی۔ پھوپھی نے فوراً شادیوں کا شوشا چھوڑ دیا۔ حشمت علی لاکھ ہاتھ پیر مارنے اور بھاگنے کے باوجود نہ بچ سکے اور زہرہ سے شادی کے لیے مجبور ہو گئے کیونکہ مقابل ان کی بہن دلہن بنی بیٹھی تھی اور فرار مشکل تھا۔ لیکن جب دونوں طرف سے رخصتی ہو گئی تو حشمت علی خان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے شہر آ گئے اور سب کی مخالفت کے باوجود فاطمہ سے نکاح کر لیا۔

دوسری طرف زہرہ نئی نویلی دلہن کے روپ میں ان کا انتظار کرتی رہ گئی تھی۔ اور یوں ان کی نفرتوں کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ حشمت علی خان بہن کا گھر اجڑنے کے خیال سے زہرہ کو چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے لہٰذا یہ رشتہ نبھانا ان کی مجبوری تھی اور اپنی مجبوری اور شوق کو نبھاتے نبھاتے وہ شہر اور گاؤں میں بٹ کر رہ گئے تھے۔ وہ ہمیشہ گھن چکر بنے رہے۔ حویلی والوں نے فاطمہ کو قبول نہیں کیا تھا اور حشمت علی زہرہ کو قبول نہیں کر سکے تھے لیکن پھر بھی زندگی بھی بسر ہو رہی تھی اور رشتے بھی چل رہے تھے۔ زہرہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ لیکن فاطمہ کے ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ حشمت کی بڑی خواہش تھی کہ فاطمہ ان کے بچے کی ماں بنے لیکن اس خواہش نے پورا ہونے میں سالوں لگا دیے تھے اور جب زیست پیدا ہوئی، حشمت علی اور فاطمہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے بیٹی کو بڑے لاڈ پیار اور ناز نخروں سے پالا تھا۔ فاطمہ نے اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن مزاج کے لحاظ سے وہ باپ پہ گئی تھی ضدی اور تیز۔

فاطمہ، حشمت علی کے سامنے ایسا کہتی تو وہ دل کھول کے ہنستے اور سینہ تان کے خوشی کا اظہار کرتے کہ ان کی بیٹی ہے تو ان ہی پہ جائے گی نا وہ شہر آتے تو زیست کو اپنے پاس اپنے سینے پہ سلاتے تھے اور باپ کی موجودگی میں وہ ماں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیتی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کی خوب جمتی تھی۔

جتنے دن وہ شہر میں رہتے وہ کھل کے انجوائے کرتی تھی اور حشمت علی بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے اور ان ہی خوشیوں بھرے دنوں میں ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔

کچن میں کام کرتے ہوئے اچانک فاطمہ کے دل میں درد اٹھا اور پھر ہمیشہ کے لیے دل کی حرکت بند ہو گئی۔

پندرہ سالہ زیست ماں کی اچانک ناگہانی موت پہ گم صم ہو کر رہ گئی۔ اس کے لیے زندگی میں سب سے بڑا ستون اس کی ماں ہی تھی اور اب

وہی ستون مٹی کا ڈھیر ہو گیا تھا۔ حشمت علی خان نے اسے زندگی کی طرف لانے کی بہت کوششیں کیں، لیکن اس کی چپ نہ ٹوٹی۔

اب حشمت علی اسے تنہا چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اتنے بڑے گھر میں ملازموں کے رحم و کرم پہ وہ کیسے رہ سکتی تھی؟ لہٰذا وہ اسے اپنے ساتھ حویلی لے آئے۔

لیکن حویلی میں اس کا وجود کسی کو بھی گوارا نہیں تھا۔ اس کے دونوں بھائی راغب علی اور جاذب علی اس کے قریب سے نفرت سے منہ موڑ کر گزر جاتے اور وہ دیکھتی رہ جاتی۔ اس کی بہن اس کے دادی، دادا، اس کے چچا اور پھوپھی کسی نے بھی کبھی اس سے ٹھیک طرح بات نہیں کی تھی اور زہرہ تو اس کے لیے سراپا نفرت تھیں۔ وہ گزرتے گزرتے اسے دو چار سنا بھی دیتی تھیں۔ حشمت علی خان کو پتا تھا کہ زیست کے ساتھ سب کا رویہ کیسا ہے لیکن وہ سب کو ایسے رویے سے روک نہیں سکتے تھے، انہوں نے بس اپنے بیٹوں اور بیٹی کو بلا کے سمجھایا کہ وہ زیست کو دکھی نہ کیا کریں وہ ان کی بہن ہے آخر۔ لیکن ان تینوں نے اسے بہن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہ اپنی ماں کی زبان بول رہے تھے، حشمت علی بے بس ہو گئے۔

پھر جیسے ہی زیست کے میٹرک کا رزلٹ آیا اس نے حشمت علی سے فرمائش کی کہ وہ اسے کالج میں ایڈمیشن لے دیں۔ انہیں اس کے پڑھنے پہ کوئی اعتراض نہیں تھا بس اعتراض تھا تو شہر میں رہنے کا کہ وہ کس کے پاس کیسے رہے گی؟ سو زیست نے ہاسٹل کا آپشن سامنے رکھ دیا اور بالآخر وہ مان ہی گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہاں حویلی میں رہ کر بھی وہ حویلی والوں کے اذیت ناک رویے کا عذاب سہہ رہی ہے لہٰذا انہوں نے بیٹی کو آزاد زندگی جینے کا پروانہ سونپ دیا تھا اور وہ تب سے اب تک ہاسٹل میں رہتی آ رہی تھی پہلے کالج پھر یونیورسٹی اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔

پہلے سمسٹر میں ٹاپ کرنے پر حشمت علی نے اسے گاڑی گفٹ کی تھی۔ وہ بی ایس آنرز کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں ذہین اور لائق بھی جاتی تھی اور حشمت علی کو اس پہ فخر ہوتا تھا۔ لیکن ان کے دوسرے بچے جل کے رہ جاتے تھے۔

☆☆☆

"سلام دادی! کیسی ہیں؟" زیست، حشمت علی خان کے ساتھ گاڑی سے اتر کر سیدھی دادی کے قریب آئی تھی جو لان میں موڑھے ڈالے بیٹھی زہرہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

"ہاں...... ہاں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے بس سرسری سا اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا تھا، حالانکہ وہ سات ماہ بعد حویلی آئی تھی۔ زیست نے پلٹ کر حشمت علی خان کو اک نظر دیکھا انہوں نے اسے درگزر کا اشارہ دیا۔

"سلام آنٹی!" اس نے مروتاً زہرہ کو بھی سلام کیا حالانکہ وہ اسے دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر چکی تھیں۔

"آؤ بیٹا! اندر چلو تھک گئی ہو آرام کر لو۔" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر آگے بڑھ گئے کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ زہرہ سلام کا جواب نہیں دے گی۔

ہونہہ! بڑی آئی مہارانی، تھک گئی ہو گی۔" زہرہ کو آگ چھونے لگی۔ اب یہ سلسلہ تب تک رہتا تھا جب تک زیست نے حویلی رہنا تھا۔

"ارے زہرہ! تو کیوں خون جلاتی ہے اپنا؟ چار دن کے لیے آتی ہے چلی جاتی ہے۔" دادی نے بہو کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"چار دن بھی بہت ہوتے ہیں اماں! ابرار خان جتنی دیر یہ منحوس یہاں رہتی ہے اس کے آس پاس پھرتا اسی کی فکروں میں لگا رہتا ہے۔"

"ارے، اس کی بیٹی بے فکر تو کرے گا ہی۔" دادی کا بھی جواب نہیں تھا کسی کی بھی طرف دار ہو جاتی تھیں۔

"بیٹی تو خزینہ بھی ہے، اس سے تو کبھی اتنا پیار نہیں کیا؟"

"پگلی خزینہ پاس جو رہتی ہے اور وہ بے چاری ہمیشہ شہر میں۔"

"کیا ہوا ہے اماں سائیں؟" خزینہ قریب آ بیٹھی۔

"تمہارے بابا جان کی بھتیجی آئی ہے شہر سے۔"

"او اچھا پھر تو بڑی خاطر داریاں ہوں گی؟" خزینہ کے لہجے سے جلن نمایاں تھی۔

"ہاں شروع ہو چکی ہیں، وہ دیکھ لو۔" انہوں نے ملازمہ کی طرف اشارہ کیا جو گاڑی سے زیست کا بیگ نکال کر اندر لے جا رہی تھی۔

"واہ کیا قسمت پائی ہے، ماں نے بھی ہمارے سینے پہ مونگ دلتے ہوئے ٹھاٹھ سے زندگی گزاری اور بیٹی بھی عیش کر رہی ہے اور ایک ہم ہیں اس چار دیواری میں بند۔" خزینہ کو اپنی زندگی پہ افسوس ہوا تھا۔

"بس بیٹا صبر کرو اللہ صبر کا پھل ضرور دیتا ہے۔" زہرہ نے بیٹی کو دلاسا دیا اور دادی وہاں سے اٹھ کے اندر آ گئیں۔ انہیں پتہ تھا کہ ان کا یہ دکھ بھرا ڈرامہ دیر تک چلے گا۔

☆☆☆

زیست باتھ روم سے باہر نکلی تو موبائل کی ٹیون پہ چونک گئی، اس کا موبائل بیڈ پہ رکھا تھا۔ اور متواتر رنگ ہو رہی تھی۔ اس نے سیل اٹھا کر دیکھا "مکرم کالنگ" پڑھ کے وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔

"ہیلو......؟" تولیہ سائیڈ پہ رکھتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔

"کہاں تھیں تم؟ کب سے فون کر رہا ہوں۔" ......مکرم کا انداز استحقاق بھرا تھا۔

"شاور لے رہی تھی۔" اس نے مختصر بتایا۔

"اوہ...... میں سمجھا سیل کہیں چھوڑ گئی ہو۔"

"نہیں جناب! گاؤں آتے ہوئے میں سیل کیسے چھوڑ کر آ سکتی تھی؟" زیست نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں سلجھانے کی کوشش کی۔

"گاؤں؟" مکرم بری طرح چونکا۔ اور جواباً زیست بھی ٹھٹک گئی لیکن پھر جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولی۔

"جی جناب گاؤں۔ میرا آبائی گاؤں۔ بابا مجھے لینے گئے تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ آنا پڑا۔"

"لیکن تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" مکرم کے انداز میں افسردگی اور شکوہ گھلا ہوا تھا۔

"میں نے آپ کے نمبر پہ ٹرائی کیا تھا مگر آپ کا نمبر آف تھا۔"

"زیست! میرا نمبر آف ہو بھی تو محض تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے، یقیناً میں کسی میٹنگ میں تھا۔ تم بعد میں تو بتا سکتی تھیں؟" رفتہ رفتہ مکرم کی

آواز پہ افسوس کے ساتھ ساتھ اداسی کا غبار بھی چھا رہا تھا۔

"بتا دیتی تو آپ کیا کرتے؟ مجھے روک لیتے؟" زیست لاپروائی سے کہتی گیلے بالوں سمیت بیڈ پہ نیم دراز ہوگئی۔

"ہاں میں روک لیتا، کیونکہ ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تین دن ہو چکے ہیں۔" اس کی بے قراری ہر لفظ، ہر انداز سے عیاں تھی۔

"تین دن ہو چکے ہیں ناں؟ تین سال تو نہیں؟" زیست ابھی بھی نارمل تھی، وہ مکرم کی بے چینیوں سے حظ اٹھا رہی تھی۔

"تم تین سال کہتی ہو؟ مجھے تو تین صدیاں لگ رہی ہیں۔" اس نے جیسے اپنی بے قراری کا عالم بتایا تھا اور زیست حقیقتاً چپ رہ گئی۔

"پلیز! تم کل ہی واپس آجاؤ۔" اس کی خاموشی پہ وہ مزید بولا۔

"اتنی جلدی کیسے آسکتی ہوں؟" زیست نے حیرت سے کہا۔

"کوئی بھی بہانہ کر دو یار! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں پلیز۔"

"اف مکرم! آپ پاگل ہو گئے ہیں؟ اتنے ماہ بعد گاؤں آئی ہوں اور ایک رات گزار کے پھر واپس شہر آ جاؤں، یہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے انکار کر دیا۔

اب خاموش ہونے کی باری اس کی تھی اور پھر پانچ چھ سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے چپ چاپ فون بھی بند کر دیا تھا۔

پہلے تو زیست کو کوئی احساس نہ ہوا مگر جب اس نے کچھ بھی کہے بغیر فون بند کیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کافی بے مروتی کا مظاہرہ کر گئی ہے۔ اسے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا بلکہ نارمل طریقے سے سمجھانا چاہیے تھا اس طرح تو وہ اپنے کیے پہ خود ہی پانی پھیر دیتی۔ اس نے جلدی سے نمبر ڈائل کیا، دوسری طرف رنگ جا رہی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

"مکرم! پلیز کال ریسیو کرو۔" اس نے میسج لکھ کر سینڈ کیا۔

"تم نے جب آنا ہو آ جانا، مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا جواب بھی فوراً آیا تھا۔

"لیکن مکرم!"

"بس بھاڑ میں گیا مکرم......" وہ بڑی تیزی سے میسج کا جواب دے رہا تھا۔

"بھاڑ میں نہیں میرے دل میں۔" زیست نے مسکراتے ہوئے لکھا اور سینڈ کر دیا۔ اگلے پندرہ منٹ میں میسج کی بجائے اس کی کال آ گئی۔

زیست کے لبوں کی مسکان گہری ہو گئی تھی۔

"ہیلو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ جیسے اس کی زبان سے سننا چاہ رہا تھا۔

"جو آپ نے پڑھا۔" وہ اپنی مسکراہٹ روکنے لگی۔

"میں نے ٹھیک سے نہیں پڑھا۔ تم دوبارہ کہو۔" وہ مچل رہا تھا۔

"میں دوبارہ سینڈ کر دیتی ہوں آپ ٹھیک سے پڑھ لیجئے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"زیست کیا چاہتی ہو؟" وہ زچ ہونے لگا۔

"آپ کو تنگ کرنا چاہتی ہوں۔"

"یار! میں تو پہلے ہی تنگ ہوں اور کتنا کرو گی؟" وہ گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"اتنا کہ آپ کے آس پاس رہنے والوں کو بھی پتہ چل جائے۔" وہ دلکشی سے بولی تھی۔

"پتا چل چکا ہے۔ سب کو پتہ چل چکا ہے کہ کرم خان آفریدی کسی کا دیوانہ ہوا پھر رہا ہے۔ آغا جان مجھے خاصی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں، ارقم مجھ سے چھوٹا ہے مگر باتوں باتوں میں وہ بھی مجھے چھیڑنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اماں الگ مجھے کریدتی رہتی ہیں۔ سب جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ کرم خان کو "بے چین" کرنے والی ہستی کون ہے؟" وہ بے قراری سے بول رہا تھا۔

"تو آپ بتا دیں ناں کہ وہ ہستی کون ہے؟" زیست کے انداز کی لاپروائی ہنوز تھی۔

"پہلے اس ہستی کو تو بتا دوں۔"

"ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ یکسر انجان بنتے ہوئے بولی۔

"زیست! واقعی میرے حالِ دل سے انجان ہو یا پھر انجان بننے کی کوشش کرتی ہو۔" کرم جیسے صاف صاف بات کرنے پہ تل گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب تم خوب سمجھتی ہو تم واپس آجاؤ پھر بات کروں گا۔"

اس نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے فون بند کر دیا اور زیست بے ساختہ ہنس پڑی۔

"مطلب تو میں واقعی خوب سمجھتی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے ہیر برش اٹھایا اور بالوں میں پھیرنے لگی۔

صبح زیست کی آنکھ اچھے خاصے شور کی آواز پہ کھلی تھی اس نے ایک لمحے کے لیے سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ کہاں پہ ہے؟ پھر تکیے سے اندھیرے میں اسے بڑا سا وسیع کمرا، اونچی چھت اور دیوار گیر لکڑی کی الماری نظر آئی تو احساس ہوا کہ وہ حویلی میں ہے۔ اور جیسے ہی تمام حسیات بیدار ہوئیں ویسے ہی شور کی آواز پہ پریشانی بھی جاگ اٹھی، وہ تیزی سے بیڈ سے نیچے اتری اور چپل پہن کر باہر نکل آئی۔

"میں قتل کر دوں گا خورشید خان کے بیٹے کو..... وہ وہ جان بوجھ کر میرے سامنے آیا، اسے پتہ بھی تھا کہ سامنے میرا دشمن ہے اس نے میرے بجائے اس کی سائیڈ لی۔ اگر اسے ان کی ہی طرف داری کرنی ہے تو ہم سے کیوں تعلقات بنا رکھے ہیں؟" راغب علی خان ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑے دھاڑ رہے تھے۔ زیست نے ناسمجھی والے انداز میں آنکھیں پھیلا کر ان کو دیکھا تھا۔ وہاں تقریباً حویلی کے سبھی افراد موجود تھے اور سبھی کے چہرے پر پریشانی تھی۔

"پاگل مت بنو راغب خان! تمہاری دشمنی بادل خان سے ہے، خورشید خان کے بیٹے سے دشمنی کیوں مول لے رہے ہو؟ حشمت علی خان

نے اسے ٹوکا مگر راغب خان کے سر پہ غصے کی آگ سوار تھی۔

"یہ میری انا کا سوال ہے بابا جان! اگر ان کو قتل نہ کیا تو خود قتل ہو جاؤں گا میں ان کو چھوڑ بھی دوں تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

راغب خان واقعی سچ کہہ رہے تھے لیکن حشمت علی خان کو یہ سچ منظور نہیں تھا۔

"ہم صلح صفائی کروادیں گے تم لوگوں کی۔"

"یہ تو پھر بے غیرتی والی بات ہوئی نا؟" راغب خان کسی طور ماننے والے نہیں تھے۔

"تو ہم تمہاری غیرت کی بھینٹ کسی کی زندگی کیسے چڑھا دیں؟"

"جن کی زندگی ہے یہ ان کو سوچنا چاہیے تھا۔ گلباز نے اچھا نہیں کیا میرے مقابلے پہ آ کر....." راغب علی خان غصے سے پھنکار رہا تھا اور زیست ان کی اس قدر سفاکی پہ جھرجھری لے کر افسوس سے سر جھٹکتی واپس کمرے میں آ گئی۔

ایسے ہنگامے تو یہاں آئے روز ہوتے تھے، زیادہ ہاتھ راغب علی خان کا ہی ہوتا تھا حالانکہ حشمت علی خان نے ان کو نکیل ڈالنے کے لیے ان کی شادی بھی نوجوانی میں ہی کر دی تھی اب ان کی پانچ سال کی بیٹی بھی تھی مگر پھر بھی ان کے انداز و اطوار اور مزاج نہیں بدلا تھا جس پہ حشمت علی خان ہمیشہ ہی خائف رہتے تھے۔ وہ ہر کسی سے دشمنیاں نہیں پال سکتے تھے لیکن راغب علی خان باپ کی بات ذرا کم ہی سنتے تھے۔

☆☆☆

"سر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" اس کی سیکرٹری نے انٹرکام سے اطلاع دی۔

"کون ہے؟" وہ کافی مصروف تھا۔

"سر! وہ نام نہیں بتا رہیں۔"

"اوکے اندر بھیج دیں۔" پہلے تو وہ چونکا پھر سرسری سا کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"السلام علیکم۔" زیست گلاس ڈور کھول کر دبیز کارپٹ پہ بنا آہٹ پیدا کیے آہستگی سے چلتی ہیں اس کی ٹیبل کے پاس پہنچ گئی اور زیست کی آواز پہ کرم کے ہاتھ سے پین چھوٹ گیا تھا۔

"زیست! تم یہاں؟" وہ مارے خوشی کے یکدم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں میں یہاں نہیں آ سکتی؟" اس نے زکرم کے انگ انگ سے پھوٹتی خوشی کو محسوس کر کے بھی خود کو انجان ظاہر کیا

"آ سکتی ہو یار آ سکتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم خود میرے آفس آئی ہو؟" وہ واقعی بے پناہ خوش تھا۔

"بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟"

"تمہارا اپنا آفس ہے، جہاں جی چاہے بیٹھو۔" اس نے چاروں طرف اشارہ کیا تھا۔

زیست اس کا کمرہ گھوم پھر کر دیکھنے لگی۔ نظروں میں ستائش تھی۔

''پسند آیا اپنا آفس؟'' وہ اس کے قریب چلا آیا۔

''بہت زیادہ، بہت اعلا ذوق ہے آپ کا۔'' اس نے سراہا۔

''وہ تو میں جانتا ہوں۔'' اس نے زیست کے چہرے کو نظروں کی زد میں رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا جانتے ہیں؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کچھ نہیں، تم آؤ بیٹھو یہاں۔'' اس نے پہلی بار جسارت کی اور زیست کا ہاتھ تھام لیا۔ زیست اس کے لمس سے اندر ہی اندر کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی۔ مکرم خان آفریدی نے اسے اپنی چیئر پہ بٹھا کر بہت ہی وارفتگی سے اسے دیکھا تھا۔

''اب حکم کیجیے میڈم! آپ کا کیسے یہاں آنا ہوا؟ آپ تو گاؤں گئی ہوئی تھیں؟'' مکرم نے ٹیبل کی دوسری طرف رکھی چیئرز میں سے ایک چیئر پہ بیٹھتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں گاؤں گئی ہوئی تھی اور میرا ایک دوست بہت خفا ہو رہا تھا، وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ سو میں اپنا بیگ ہاسٹل چھوڑ کر سیدھی اس سے ملنے چلی آئی ہوں۔'' اس نے چیئر کو گھماتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''گویا دوست کچھ خاص ہی ہے۔''

''کچھ خاص نہیں، بہت خاص ہے۔'' وہ اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے تیزی سے بولی تھی۔

وہ کرسی سے اٹھ کر زیست کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ ایک ہاتھ ٹیبل پہ اور ایک ہاتھ زیست کی کرسی کی بیک پر جما کر اس کے قریب جھک آیا تھا اور زیست کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا تھا اور پہلی بار...... اتنی ملاقاتوں میں پہلی بار ایسا ہوا کہ زیست کا دل دھڑکا تھا اور پلکوں میں لرزش آ گئی تھی۔ ان دو چیزوں نے اسے پل میں کمزور کر دیا تھا۔ اس کی جھکی پلکوں پہ مکرم کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ زیست نے آج تک اس کے سامنے نظریں نہیں جھکائی تھیں اور آج اگر جھکائی تھیں تو یقیناً کوئی بات تھی؟

''زیست......!''

''ہوں، کہہ دوں؟'' وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا؟''

''وہی جو تم سے کہا نہیں جا رہا۔'' وہ جیسے سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ خود سے اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''تم کیا جانو زیست! ساری باتیں ایسی ہی تو ہیں، کبھی تم رک جاتی ہو، کبھی میں ٹھہر جاتا ہوں مگر آج مجھے لگتا ہے کہ مجھے سب کہہ دینا چاہیے، آج تم خود میرے پاس آئی ہو، آج مجھے تم کو خالی ہاتھ نہیں بھیجنا چاہیے، آج میں تمہارا دامن اپنے اظہار سے اپنی محبت سے بھر دینا چاہتا ہوں۔ آج میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تم میری زیست ہو، میری زندگی، میری محبت، میری ساتھی۔''

اس نے گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے زیست کے دل میں ہلچل مچا کے رکھ دی تھی اس کے سینے میں طوفان برپا ہونے لگے تھے۔ زیست اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ اسے لگا اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا ہے اسے اپنا آپ سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا اسے خود پتہ نہ چل سکا کہ اس کی ایسی کیفیت مکرم خان کی قربت سے ہوئی ہے یا اظہار محبت سے......؟

''مکرم آپ!'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''زیست! تم سے میری محبت کا اب یہ عالم ہے کہ میں ایک دن ایک پل بھی تمہارے بغیر بہت مشکل سے گزار رہا ہوں۔ تمہارے بغیر رہنا ناممکن ہو چکا ہے میرے لیے۔''

مکرم سب کچھ کہتا چلا گیا تھا اور زیست سے مزید ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مگر وہ اتنا قریب جھکا ہوا تھا کہ وہ اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن بھلا ہوا اس کی سیکرٹری کا وہ دروازہ ناک کر کے اندر چلی آئی۔

''مے آئی کم ان سر؟'' وہ اندر داخل ہو کر اجازت طلب کر رہی تھی۔ مکرم فوراً سیدھا ہو گیا تھا۔

''یس۔'' اس نے اجازت دی۔ سیکرٹری اپنے باس کی سیٹ پر اس لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر عجب ذومعنی نظروں سے دیکھنے لگی تھی اور ساتھ ہی اسے اس لڑکی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ مکرم نے فائل پہ سائن کرنے کے بعد سیکرٹری کو جانے کا اشارہ کیا اور زیست کی سمت متوجہ ہوا۔

''اب کیا پروگرام ہے؟ لنچ کرو گی؟'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں مجھے جانا ہے۔'' وہ کچھ نروس ہو رہی تھی۔

''میں نے تمہارے لیے ایک تحفہ خریدا ہے۔''

''میں نے سوچا آج سے زیادہ بہتر دن تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔'' اس نے کہتے ہوئے جھک کر ٹیبل کی درمیانی دراز کھولی اور ایک بلیو کلر کی مخملی ڈبیا نکال لی۔ اور پھر ڈبیا کھول کر ایک انتہائی نازک اور خوبصورت سی چین نکال لی...... چین بہت نفیس اور باریک تھی دیکھنے میں اتنی خاص نہ لگتی لیکن اس کے درمیان سجا چھوٹا سا ڈائمنڈ اسے بہت خاص اور خوبصورت بنا رہا تھا۔ اس ڈائمنڈ کی ڈیزائننگ بھی بہت خوبصورت تھی، زیست اتنا قیمتی گفٹ دیکھ کر حیران رہ گئی اسے روکنا چاہا تو وہ بولا۔

''تم بس خاموش رہو۔'' اس نے سامنے اشارہ کیا اور چین کی ہک کھول کر اس کی گردن میں پہنا دیا تھا۔

''پلیز مکرم! میں یہ افورڈ......''

''میں نے کہا ناں تم چپ رہو۔'' اس نے زیست کو روک دیا اور اس کی گردن میں گلی چین دیکھنے لگا جس کی قیمت اس کی نظر میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔

''لیکن! اگر تم گفٹ کا بدلہ دینا چاہتی ہو تو دے دینا۔ میں تمہاری طرف سے گفٹ کا منتظر رہوں گا۔'' اس نے زیست کی مشکل حل کی لیکن زیست چپ سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"ارے واہ اتنا قیمتی گفٹ؟" سحرش اور ارمین کے منہ میں پانی آ گیا تھا جبکہ ثانیہ کافی سنجیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا اس نے تمہیں پرپوز کیا ہے؟" ثانیہ کا سوال ہمیشہ کی طرح تیکھا ہی تھا۔

"پرپوز کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے کیا؟" سحرش نے خفگی سے کہا۔

"کسر تو رہ ہی جاتی ہے محترمہ سحرش صاحبہ! اس نے محض ایک قیمتی گفٹ دیا ہے چند خوبصورت خواب دکھائے ہیں، لیکن شادی کے لیے ہرگز نہیں کہا۔"

"پرپوز کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور اگر وہ کر بھی دے تو زیست کے پاس کیا ثبوت ہے کہ اس نے اسے پرپوز کر دیا ہے۔ ہم کیسے یقین کر لیں؟ یہ شرط ہارنے کے خیال سے جھوٹ بھی تو بول سکتی ہے" ثانیہ طنز و تمسخر سے کہہ رہی تھی۔ زیست اسے بڑی کاٹ دار نظروں سے گھور رہی تھی۔

"اس بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا چاہتی ہو تم؟" وہ چبا کر بولی تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ مکرم خان آفریدی اگر تم سے اظہار محبت کرتا ہے یا پھر تمہیں پرپوز کرتا ہے تو ہمارے سامنے کرے تاکہ ہمیں پتہ تو چلے کہ وہ تمہیں کس حد تک چاہتا ہے؟ اور تم اسے اپنے جال میں پھنسانے میں کس حد تک کامیاب ہو گئی ہو۔"

ثانیہ کافی چڑانے والے انداز میں بولی تھی۔ زیست نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا تھا وہ پہلے ہی مکرم کے حوالے سے تھوڑی پریشان ہو رہی تھی اوپر سے ثانیہ کی باتیں سلگا رہی تھیں۔

"کیا ہوا سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

"ٹھیک ہے وہ سب کے سامنے ہی مجھے پرپوز کرے گا۔"

زیست فیصلہ سنا کر وہاں سے اٹھ گئی تھی اور سحرش ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کسی انسان کی عزت نفس اس طرح مجروح کرنے کے حق میں ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ثانیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور زیست کے پیچھے آ گئی۔

"زیست! یہ سب کیا ہے؟ کیوں کر رہی ہو ایسا؟ تم جانتی ہو ایسا کرنا اس آدمی کی بے عزتی کرنے کے برابر ہوگا؟"

"ہاں جانتی ہوں۔" زیست کا لہجہ بوجھل تھا۔

"پھر بھی ایسا کر رہی ہو؟" سحرش کو حیرت ہوئی۔

"تو پھر اور کیا کروں؟ جب اتنا کچھ کر لیا ہے تو یہ سب تو کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے طنزیہ انداز میں سر جھٹکا۔

"لیکن زیست! یہ ایک انتہائی قدم ہے۔"

"جانتی ہوں، میں بعد میں اس سے معافی مانگ لوں گی، وہ واقعی بہت اچھا انسان ہے، وہ جس کا بھی شوہر بنے گا اس کی بیوی خود پہ رشک کرے گی۔ بہت ہی خوش قسمت ہوگی وہ لڑکی جو اس کی بیوی بنے گی۔" کہتے کہتے اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔ اس نے مکرم کے لیے اپنے دل میں آج تک محبت کا جذبہ محسوس نہیں کیا تھا وہ اس سارے معاملے کو ہمیشہ کھیل اور تماشہ سمجھ کر کرتی رہی تھی لیکن کھیلتے کھیلتے جس طرح کھلونوں سے انسیت ہو

جاتی ہے اسی طرح اسے بھی کرم سے انسیت اور اپنائیت ہو گئی تھی۔ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اسے توڑنا چاہتی تھی۔ مگر یہ اس کی مجبوری تھی۔ اس کو "توڑے" بغیر اور "چھوڑے" بغیر گزارا بھی نہیں تھا۔

"ہو جو غلطیاں یہ سوچ کر کی جائیں کہ بعد میں ان کی معافی مانگ لیں گے، ان غلطیوں کی کبھی معافی نہیں ملتی زیست! پلیز ایک بار پھر سوچ لینا۔" سحرش اسے سمجھا رہی تھی۔

"سحرش! میں کرم خان کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی مگر پھر بھی یہ ٹھیس اسے ضرور لگے گی، آج نہیں تو کل ایسا ہو کر ہی رہے گا کیونکہ ہم ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس کا قبیلہ ہم سے الگ ہے۔ ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک عارضی رشتہ تھا، ایک ڈرامہ تھا جو میں نے نبھا دیا۔ لیکن ایسا ہمیشہ تو نہیں ہو سکتا ناں؟ میرے باپ اور بھائیوں کو پتہ چل جائے تو جیتے جی مار ڈالیں مجھ کو۔"

زیست اب بے بسی کے مقام پہ کھڑی تھی۔ سحرش خاموش ہو گئی ان ہی چیزوں کا تو ڈر تھا جو آج سامنے آ رہی تھیں۔ زیست لب بھینچتی ہوئی جا کر کمرے میں لیٹ گئی۔

☆☆☆

آج کرم خان آفریدی کا برتھ ڈے تھا۔ رات بارہ بجے ہی اسے سب نے وش کرنا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلی کال خان صاحب کی اور دوسری ارقم کی تھی۔ باقی کزنز اور جاننے والے فرینڈز نے اسے میسجز اور کالز کی تھیں لیکن جس کا اسے انتظار تھا اس نے تو کوئی مس کال بھی نہیں دی تھی۔

وہ رات بارہ بجے سے لگاتار انتظار کر رہا تھا اور انتظار کے لمحات بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی تشویش اور پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ زیست اس کی برتھ ڈے بھول جائے اور اسے وش نہ کرے.....؟ وہ صبح تک انتظار میں رہا اور پھر پریشان ہوتے ہوئے اس نے زیست کا نمبر سرچ کیا۔ ابھی اس نمبر پہ یس کا بٹن دبانے والا ہی تھا کہ ملازم اندر داخل ہوا۔

"صاحب! آپ کو کوئی باہر بلا رہا ہے؟"

"کون ہے؟"

"پتا نہیں صاحب! چوکیدار نے انٹرکام پہ اطلاع دی ہے۔" ملازم نے لاعلمی ظاہر کی۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر باہر گیٹ پہ آ گیا۔ باہر کوریئر سروس کا نمائندہ کھڑا تھا۔ اس نے کرم سے سائن کروانے کے بعد گفٹ اس کے حوالے کر دیا۔ کرم حیران ہوتا گیٹ سے اندر آ گیا۔

"خوبصورت سرخ گلابوں کا بکے اور سرخ ہی گلاب کے پھولوں سے سجا برتھ ڈے کارڈ تھا اور کارڈ پہ زیست کا نام پڑھ کر کرم کے ہونٹوں کو اطمینان بھری مسکراہٹ چھو گئی تھی اور بکے اور کارڈ کے ساتھ ایک پیکنگ شدہ گفٹ بھی تھا وہ دیکھتا ہوا اندر کمرے میں آ گیا اس نے گفٹ کھول کر دیکھا۔

سلور ڈائل اور سلور چین والی انتہائی قیمتی گھڑی کرم کی ستائشی نظروں کا مرکز تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ یہ گھڑی ہمیشہ آپ کے بازو پہ سجی رہے اور آپ جب جب اسے دیکھو، آپ کو میری یاد آئے۔" گھڑی کے کیس میں اس

نے ایک چٹ پہ پیغام بھی لکھ کر بھیجا تھا۔ مکرم کی خوشی مزید بڑھ گئی۔ اس نے آج نہا کر تیار ہونے کے بعد وہی گھڑی پہنی تھی اور پھر زیست کو میسج لکھا۔

"تم تیار رہو۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ آج کا دن ہم ساتھ ہی گزاریں گے۔" اسے میسج سینڈ کرنے کے بعد وہ ناشتہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔

وہ ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ آغا جان کی کال آ گئی۔ "کیسے ہو میری جان؟"

"بالکل فٹ۔ میری بہو کیسی ہے؟" ان کے لہجے میں محبت تھی۔

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" اب سے ایک ہفتے قبل وہ جھجکتے ہوئے تمام تفصیل ان کے گوش گزار کر چکا تھا۔

"بیٹا اس سے بات کرو۔ اس کے گھر جاؤ یا پھر ہمیں بتاؤ ہم خود جائیں۔ دیر کس بات کی ہے بھلا؟" وہ مکرم کو بات آگے بڑھانے پر اکسا رہے تھے۔

"جی میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میں آج ہی اس سے بات کرتا ہوں۔" اس نے حامی بھری۔

"کیا آج تم گاؤں نہیں آ سکتے؟" خان صاحب نے وہ بات کی جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے فون کیا تھا۔

"کیوں خیریت؟" وہ متفکر ہوا۔

"ہاں سب خیریت ہے بس تم سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔" انہوں نے کہہ ہی دیا۔

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔ آپ کیا کر رہے ہیں" اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"پنچایت میں جانا ہے، تیار ہو رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر آپ جائیں۔ میں جب آیا آپ کو فون پہ بتا دوں گا۔" اس نے انہیں خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد وہ زیست کے ہاسٹل پہنچا تو زیست اپنی فرینڈز کے ساتھ ویٹنگ روم سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پانچوں ہی رُک گئیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے ایک ساتھ سب ہی کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ آئیے ناں آپ رُک کیوں گئے؟" زیست کافی سنجیدہ لگ رہی تھی۔ سحرش اندر سے گھبرا رہی تھی۔

"کیسی ہیں آپ سب؟" وہ زیست کو چھوڑ کے اس کی فرینڈز سے حال احوال پوچھنے لگا۔

جواباً ثانیہ نے ہی لب کشائی کی تھی۔

"ہم سب تو ٹھیک ہیں، لیکن زیست آج ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

ثانیہ نے ذومعنی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ وہ سب ہی اس وقت ویٹنگ روم میں موجود تھے۔ مکرم اسے اور اس کی فرینڈز کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ زیست نظر جھکائے ہوئے تھی۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟"

''دیکھیے مکرم صاحب! اس طرح روز روز کا ملنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے ناں؟ اب تو ہاسٹل کی لڑکیاں بھی طرح طرح کی باتیں کرنے لگی ہیں۔'' ثانیہ کی بات پہ مکرم چونک گیا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''ارے، آپ اتنے بھی بچے نہیں ہیں کہ میرا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ بغیر کسی رشتے کے بغیر کسی تعلق کے ملنا ملانا کیا ٹھیک سمجھا جاتا ہے؟'' ثانیہ نے خفگی دکھائی۔

''کیا محبت کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں ہے؟'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ارمین، رمشہ اور سحرش نے بیک وقت ثانیہ کو دیکھا جو مکرم کے اعتراف محبت پہ ذرا ساری کی تھی۔

''یہاں محبت کو کون مانتا ہے جب تک کوئی مضبوط رشتہ نہ ہو؟'' ثانیہ ڈٹی ہوئی تھی۔

''جب میں زیست کو اپنی بیوی بنا کے دلہن کے روپ میں ساتھ لے جاؤں گا تب تو سب مانیں گے ناں؟''

اب کی بار ثانیہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مکرم ٹال مٹول سے کام لے گا لیکن وہ تو......

''زیست! میں آپ سے آج یہی بات کرنے آیا تھا۔ مجھے آغا جان نے بھی یہی کہا ہے، میں آپ کے والدین سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بتائیں کیا آپ کو میرا ساتھ قبول ہے؟''

مکرم خان آفریدی نے سب کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے پرپوز کر ڈالا تھا اور جہاں زیست کے دل میں اس کے اقرار پہ ٹھنڈک اور اپنی جیت کی خوشی پھوار بن کر برسی تھی وہیں دکھ کی لہر بھی اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔

''زیست! بولیں ناں؟ میں آغا جان اور اماں جان کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔''

وہ اس سے بولنے پہ اصرار کر رہا تھا جبکہ وہ چپ تھی۔

''کیا بات ہے، آپ چپ کیوں ہیں؟''

''مکرم آپ......'' وہ کچھ کہنے کے لیے لب کھول ہی رہی تھی کہ مکرم کا سیل بجنے لگا۔

مکرم سیل پہ نمبر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا اس کے چچا جان کا نمبر تھا۔ اور وہ کبھی بھی ''یونہی'' فون نہیں کرتے تھے۔

''اچھا زیست! میں کل تمہارا جواب سننے آؤں گا۔'' وہ کال ریسیو کرتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔ اور اس کے پیچھے ان سب کی ہلڑ بازی شروع ہو گئی تھی۔ ثانیہ وغیرہ نے باقاعدہ پلاننگ سے مکرم سے اس طرح کی بات کی تھی کہ اگر وہ پرپوز کرنا چاہتا ہوا تو ابھی کر دے گا اور پھر ایسا ہی ہوا تھا پلاننگ کامیاب ٹھہری تھی۔

''اب بولو محترمہ زیست تو اپنی شرط جیت گئی ہے۔ اب تم کیا کرو گی؟''

مکرم فون کال سن کر بے حد پریشان ہو گیا تھا اس نے فوراً ہی گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا تھا اور وہ زیست کو بھی بتانے دوبارہ ویٹنگ روم کی

طرف آیا ہی تھا کہ ایک لڑکی کی آواز پہ قدم ٹھٹک کے رُک گئے تھے۔

"ہونہہ! مجھے نہیں پتہ تھا کہ مکرم خان اتنا دل پھینک قسم کا آدمی ہو گا میں نے تو شرط اس کی پرسنالٹی دیکھ کر لگائی تھی کہ زیست چاہے کچھ بھی کر لے مگر وہ قابو نہیں آئے گا لیکن وہ تو خیر سے دل ہاتھ پہ لیے پھر رہا تھا فوراً ہی نذرانہ دینے پہنچ گیا اور دس ہزار کی شرط میں ہار گئی.....اس کا تو کچھ نہیں گیا۔" ثانیہ تلملاتے ہوئے کف افسوس مل رہی تھی۔

"ارے، اس کا کیوں نہیں گیا؟ اس کا دل گیا، اس کا اظہارِ محبت گیا، اس کا پرپوزل گیا۔ سب کچھ اسی بے چارے کا تو گیا۔ بس زیست کا کچھ نہیں گیا۔ صرف دو لوگوں کو نقصان ہوا ہے۔ مکرم خان کا دل اور ثانیہ بی بی کا دس ہزار۔ فائدے میں تو زیست رہی ہے دل بھی لے اڑی اور دس ہزار کیش بھی۔"

ارمین نے سارا حساب کتاب کیا تھا اور ویٹنگ روم کے باہر کھڑا مکرم خان جیسے سناٹے میں آ گیا تھا۔ اسے اپنی سماعتیں مفلوج ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔

زیست نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا؟ اس کے ساتھ ڈرامہ کیا؟ اسے بے وقوف بنایا وہ بھی محض ایک شرط کی خاطر، دس ہزار کیش کی شرط! وہ اس کے جذبات سے کھیل گئی، روند گئی سب کچھ؟

اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اسے اپنی ذات کی توہین اور اپنے دل کے پرخچے اڑتے محسوس ہو رہے تھے اس کے دل و دماغ کسی طوفان کی زد میں تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کیسا ری ایکشن دے؟ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتا اس کا موبائل ایک بار پھر بجا تھا اور وہ اک غضب ناک نظر ویٹنگ روم پہ ڈالتا یکدم لب بھینچتے ہوئے واپس مڑ گیا تھا۔ ویٹنگ روم سے ان لوگوں کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔

مکرم خان نے گاڑی بہت غصے کے عالم میں نکالی تھی۔ اسے اسی وقت گاؤں نہ پہنچنا ہوتا تو یقیناً وہ کوئی ری ایکشن دیتا مگر اس وقت اسے گاؤں پہنچنے کی جلدی تھی جہاں بقول چچا سائیں کے پنچائیت میں جھگڑا ہو گیا تھا اور آغا جان اس جھگڑے میں زخمی ہو گئے تھے۔ زیادہ پریشانی والی بات تو نہیں تھی لیکن پھر بھی مکرم انتہائی پریشان تھا اس کا سر کٹ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جلد از جلد گاؤں پہنچنا چاہتا تھا۔ اور اس کشمکش کے عالم میں وہ بہت جلد زیست والا معاملہ ذہن سے جھٹک کر بیٹھا تھا اور ایک بار پھر اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

وہ ابھی راستے میں ہی تھا جب چچا سائیں کی کال آئی۔ "تم پشاور آ جاؤ، گاؤں مت جانا آغا جان ہسپتال میں ہیں؟"

"چچا سائیں! آپ بتاتے کیوں نہیں، کیا بات ہے؟ آغا جان ٹھیک تو ہیں؟" وہ مزید ضبط نہیں کر سکا تھا۔

"آ کر خود دیکھ لو، ہم میں ہمت نہیں ہے۔" انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

''آغا جان! میں، میں آ گیا ہوں۔ میں آ گیا ہوں آپ سے ملنے، آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے نا؟ پلیز آغا جان آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھیں، میں آپ کا کرم! آپ کا بیٹا! خدا کے لیے مجھے دیکھیں، میری آواز سنیں۔'' وہ ان کے بے جان وجود سے لپٹا رو رہا تھا۔ انہیں پکار رہا تھا۔

''کرم! حوصلہ کرو، موت تو اک دن سب کو آنی ہے۔'' سردار خورشید خان نے آگے بڑھ کے اسے پیچھے ہٹانا چاہا تھا۔

''وہ میرا انتظار کرتے چلے گئے؟ وہ مجھ سے ملے بغیر چلے گئے؟ میں میں...... اپنے...... اپنے بابا سے مل بھی نہ سکا؟ ان سے کچھ کہہ بھی نہ سکا؟'' وہ روتے ہوئے پاگل ہو رہا تھا۔

''کرم! پیچھے ہٹو گھر بھی جانا ہے۔'' چچا جان بھی آگے بڑھ آئے مگر وہ ان کے قریب سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بڑی مشکل سے دو تین لوگوں نے اسے پیچھے کھینچا اور ڈیڈ باڈی ایمبولینس تک پہنچائی تھی اب ان لوگوں کو حویلی جانا تھا۔ کچھ لوگ سردار خورشید خان کے بیٹے گل باز خان کے پاس ٹھہر گئے تھے اسے بھی گولیاں لگی تھیں وہ آئی سی یو میں تھا اس کی حالت بھی خاصی تشویش ناک تھی۔

☆☆☆

زیست پچھلے پانچ دنوں سے تشویش کا شکار تھی۔ وہ مسلسل کرم خان کے نمبر پہ ٹرائی کر رہی تھی مگر اس کا نمبر مسلسل آف تھا۔

زیست کی پریشانی پہ سحرش نے اسے ٹوکا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے اس سے کانٹیکٹ کر کے؟ وہ اگر خود ہی پیچھا چھوڑ گیا ہے تو شکر ادا کرو، تمہاری شرط تو پوری ہو گئی نا؟''

''لیکن سحرش! وہ اس طرح غائب ہونے والا نہیں تھا اگر وہ کہیں گیا ہے تو مجھے بتا کر کیوں نہیں گیا، شرط کی بات تو ہمارے درمیان تھی، اسے تو پتا نہیں تھا نا؟'' زیست جھنجلائی۔

وہ سحرش وغیرہ کو اپنے اندر کا حال نہیں بتا سکتی تھی ان سے کیسے کہہ دیتی کہ اسے کرم خان کے لیے فکر ہو رہی ہے؟ پھر ایک دن وہ گاڑی لے کر اس کے گھر چلی آئی لیکن گیٹ پہ تالا دیکھ کر اس کے طوطے اڑ گئے تھے۔

''آخر کرم خان کہاں چلا گیا ہے؟'' وہ اسٹیرنگ پہ ہاتھ مار کر سوچنے لگی مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آفس گئی تو پتا چلا کہ وہ لوگ بھی لاعلم ہیں، وہ اتنے دنوں سے بغیر بتائے غائب تھا۔

''وہ ایسا لاپروا انسان تو نہیں ہے؟ کہاں پھنس گیا ہے آخر؟'' وہ سوچ سوچ کے پاگل ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نواب خان آفریدی کا قتل تم نے کیا ہے اور خون بہا بھی تم ہی دو گے، مجھے اپنے کسی بھی کام میں شامل مت سمجھو، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔''

حشمت علی خان غصے اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلند آواز سے بولے تھے۔ راغب علی پریشان حال کھڑے تھے۔

''بابا! عزینہ کی منگنی ہو چکی ہے اور...... اور زرینہ تو ابھی پانچ سال کی ہے۔ میں، میں کیسے اسے خون بہا میں دے دوں؟''

راغب علی بے بسی کی انتہا پہ تھے، کیونکہ بات اپنی بیٹی پہ آ رہی تھی، لیکن دوسری طرف حشمت علی خان تھے وہ بھی بات کا مطلب سمجھ کر تڑپ اٹھے تھے، کیونکہ بات ان کی بیٹی پہ آ رہی تھی۔

"خبردار راغب علی خان، زبان کھینچ لوں گا، اگر تم نے میری بیٹی کا نام کسی غلط فیصلے میں لیا تو۔" وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"لیکن بابا اس طرح تو......"

"چاہے کچھ بھی ہوتا رہے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، تمہاری بیٹی خون بہا میں جائے یا پھر بدلے میں تمہیں قتل کر دیا جائے۔ میری بلا سے، میری زیست پہ بری نظر مت ڈالنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

حشمت علی خان کسی طور ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ باپ کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے حالانکہ ان کا رشتہ باپ اور بیٹے کا تھا لیکن اس وقت وہ صرف اپنی اپنی بیٹی کے باپ تھے۔ راغب علی خان کی بیٹی حشمت علی خان کی کیا لگتی ہے؟ وہ یہ رشتہ نظر انداز کر چکے تھے اور حشمت علی خان کی بیٹی راغب علی خان کی کیا لگتی ہے؟ وہ بھی اس رشتے کو بھول بیٹھے تھے۔ ان کو پوتی کا احساس نہیں تھا اور اس کو بہن کی فکر نہیں تھی۔ دونوں طرف اپنی اولاد کی فکر تھی۔

"آپ نے اسے بیاہنا بھی تو ہے؟" زہرہ نے مداخلت کی۔

"تم چپ رہو زہرہ خاتون! یہ میری بیٹی کا معاملہ ہے، تمہاری بیٹی کا نہیں۔" وہ بھڑک گئے تھے۔ "میری بیٹی میرے لیے کیا ہے؟ یہ میں جانتا ہوں تم سب کے لیے تو وہ اک عام سی لڑکی ہے۔ جس کا وجود بھی تم کو حویلی میں گوارا نہیں ہوتا، جس کے سلام کا جواب دینا بھی تم توہین سمجھتی ہو۔"

حشمت علی خان سارے حساب بے باق کر رہے تھے وہاں موجود تمام افراد چپ ہو گئے ان کے سامنے کسی کی بھی دال نہیں گل رہی تھی۔

☆☆☆

حشمت علی خان، زیست کی طرف سے اتنے پریشان اور غیر مطمئن ہو گئے تھے کہ انہوں نے اسے گاڑی بھیج کر اپنے پاس حویلی بلا لیا تھا۔ وہ خود اتنے دنوں سے پریشان تھی اوپر سے بابا کی طبیعت خرابی کا سن کر رہ نہ سکی اور فوراً ہی گاؤں آ گئی۔

پہلی بار اسے حویلی میں سب ہی پریشان اور متفکر سے نظر آئے تھے۔ ورنہ وہ جب بھی یہاں آتی سب چہروں پہ نفرت، حقارت، بیگانگی اور غصے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

"خیریت بابا! کیا بات ہے، سب ہی پریشان لگتے ہیں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" وہ ان کے کمرے میں ان کے پاس بیڈ پہ بیٹھی ان کے کندھے پہ سر رکھے ہوئے تھی۔

"ہاں سب ٹھیک ہے، بس راغب کا کچھ لوگوں کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے، وہ آج کل اسی میں الجھا ہوا ہے۔" انہوں نے سرسری سا بتایا۔

"او اچھا۔ میں بھی بتا نہیں کیا ہو گیا ہے سب کو۔" زیست نے بھی اس بات کو کافی سرسری لیا تھا، لیکن جب عشاء کی نماز کے بعد وہ بابا کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی تو زہرہ خاتون کے کمرے کے سامنے اسکے قدم ٹھٹک گئے تھے کیونکہ اندر سے آنے والی خزینہ کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"وہ کبھی نہیں مانے گی، جب ہمارے سگے باپ کو بیٹے اور پوتی کی فکر نہیں ہے تو وہ بھلا کیسے مان سکتی ہے؟ وہ تو ہے ہی سوتیلی۔" تحریم کا لہجہ طنز اور حقارت لیے ہوئے تھا۔ زیست متجسس ہوگئی کہ آخر بات کیا ہے، جس میں میرے ماننے کی بحث چھڑی ہوئی ہے؟

وہ دروازے کے تھوڑا اور قریب آگئی، حالانکہ دوسروں کی باتیں سننا ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ لیکن اپنے ذکر پہ وہ یہ غیر اخلاقی حرکت کرنے پہ بھی مجبور ہوگئی تھی۔

"لیکن مجھے ایک بار اس سے بات تو کرنی چاہیے ہو سکتا ہے اسے کچھ احساس ہو جائے؟ اگر وہ نہ مانی تو پھر یا تو زر مینے کو خون بہا میں جانا پڑے گا یا پھر مجھے اپنا آپ پیش کرنا ہوگا؟" یہ آواز راغب علی خان کی تھی جسے سن کر زیست کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"خون بہا؟" وہ زیر لب دہرا کے رہ گئی۔

"لیکن مجھے پتا ہے وہ اگر مان بھی گئی تو تمہارے بابا نہیں مانیں گے وہ تم لوگوں کو اتنا نہیں چاہتے جتنا اس منحوس کو چاہتے ہیں وہ ہمیشہ اسے سینے سے لگا کر رکھیں گے، آخر ان کی محبوبہ کی اولاد ہے وہ۔" یہ زہر خند لہجہ اور آواز زہرہ خاتون کی تھی۔

زیست کو اپنا آپ کھڑے کھڑے سب کے لیے عذاب لگنے لگا تھا وہ دبے پاؤں وہاں سے ہٹ گئی لیکن اپنے کمرے میں آکر اس کے آنسوؤں کو رستہ مل گیا تھا۔ تمام رات اس نے آنکھوں میں گزار دی تھی اور صبح ہوتے ہی اس نے اپنی سہیلیوں کو میسج لکھ کر سینڈ کرنا شروع کر دیے تھے اور ایک میسج اس نے مکرم خان کے نمبر پہ بھی سینڈ کیا تھا اور ساتھ ہی موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

مکرم خان آفریدی نے ایک بار فیصلہ کیا کہ وہ خون بہا نہیں لے گا، لیکن اس کے فیصلے پہ کئی لوگ بھڑک کر کھڑے ہو گئے تھے جن میں مکرم خان کے چچا اور سردار خورشید خان سر فہرست تھے اور سردار خورشید خان نے چند ایسی باتیں کیں کہ مکرم خان کو اپنے فیصلے پہ چپ ہونا پڑا۔

"ان کا فیصلہ تھا کہ اگر تم خون بہا نہیں لو گے تو ارقم خان خون بہا لے گا وہ راغب علی خان کی بہن کے ساتھ ارقم کا نکاح پڑھوا دیں گے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا ارقم ابھی بچہ ہے وہ ان چکروں میں کیسے الجھے گا؟ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" اس نے سختی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"تو پھر کل صبح تک سوچ لو تم نے کیا کرنا ہے؟ کل پنچائیت میں کون چلے گا؟ تم یا ارقم خان؟" سردار خورشید خان کہہ کر چلے گئے اور مکرم اپنی جگہ پہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

"نہیں میں ارقم کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔" وہ گہری سانس کھینچتا مردان خانے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

بیڈ پہ آکر لیٹا تو سوچیں کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔ اس کا دھیان اس دن کی طرف چلا گیا جس دن صبح کے وقت وہ حد درجہ خوش تھا اور پھر ایک کے بعد ایک بھیانک موڑ آتے چلے گئے دھیان کی رو بہہ کر نہ جانے کیسے موبائل کی طرف چلی گئی اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا موبائل نکال لیا جو اسی دن سے بند پڑا تھا۔ اس نے پاور کا بٹن دبا کر سیل آن کیا، چند سیکنڈ نیٹ ورک سرچ ہوا، پھر سارا نیٹ ورک سیٹ ہو گیا تھا سب سے پہلے جو میسج ریسیو ہوا وہ زیست کا ہی تھا میسج شاید آج ہی سینڈ کیا گیا تھا اس لیے موبائل آن کرتے پر مل گیا تھا۔ اس نے ٹائمنگ چیک کی آج

میسج کا ٹائم درج تھا اس نے لب بھینچتے ہوئے میسج پڑھا۔

"مجھے معاف کر دینا کرم خان!"

انتہائی مختصر الفاظ لکھے تھے جن کو پڑھ کر کرم خان کا خون کھول اٹھا تھا۔

"تمہیں معاف کر دوں زیست علی؟ تمہیں معاف کر دوں؟"

وہ میسج دیکھتے ہوئے چیخا اور پھر انتہائی نفرت اور غصے سے موبائل پوری قوت سے دیوار پہ دے مارا تھا جو کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ شور کی آواز پہ دروازے پہ دستک ہوئی، مگر اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

☆☆☆

نکاح کے دوران کرم کا ذہن صرف ایک لفظ پہ اٹکا تھا اور پھر سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی اسی ایک لفظ پر اٹکا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے شک کی تردید کرنا چاہتا تھا لیکن پنچایت ختم ہوتے ہوتے بھی کافی ٹائم لگ گیا تھا۔

اس نے انتہائی شکست خوردہ سے بیٹھے حشمت علی خان کو دیکھا، وہ صدیوں کے بیمار لگ رہے تھے تاہم راغب علی خان کا صرف سر جھکا ہوا تھا۔ کرم اک قہر آلود نظر ان پہ ڈال کے وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

حشمت علی خان نے کافی دکھ بھری نظر سے کرم خان کو دیکھا، آف وائٹ کھدر کا شلوار سوٹ اور پشاوری کھیڑی پہنے وہ وہاں بیٹھے دوسرے پٹھان مردوں جیسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کے رنگ ڈھنگ بھی انہی جیسے تھے۔ وہ ان کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھل چکا تھا۔ حالانکہ حشمت علی خان نے نواب خان آفریدی کے اس بیٹے کو ہزاروں بار شہر آتے جاتے دیکھا تھا لیکن تب وہ ایسا نہیں لگتا تھا جیسا آج لگ رہا تھا۔

اس کی حقارت بھری نظریں اور انداز دیکھ کر انہیں پہلے سے ہی احساس ہو گیا تھا کہ ان کی بیٹی کی زندگی عذاب میں گزرے گی۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اس کے سکون، صبر اور خوشی کے لیے دعا کی تھی حالانکہ انہیں پتا تھا کہ ان تینوں چیزوں میں سے اسے صرف "صبر" میسر آئے گا۔ سکون اور خوشی نہیں ملیں گے۔ پنچایت برخاست ہو گئی۔ وہ اپنی لاش گھسیٹتے گھر آ گئے تھے۔ انہیں بیٹے کے آگے لاڈلی بیٹی ہارنی پڑی تھی۔

☆☆☆

اپنے شک کی تصدیق کے لیے وہ حویلی آتے ہی اپنے کمرے میں گیا تھا۔ اسے دروازے سے ہی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز سنائی دی تھی اور اندر داخل ہوتے ہی اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ شک، شک نہیں رہا تھا بلکہ یقین میں بدل گیا تھا۔ حالانکہ وہ اندر سے دعا کر رہا تھا کہ اللہ ایسا کبھی نہ کرنا۔ مجھے زیست کی شکل کبھی مت دکھانا ورنہ دو لوگوں کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اپنے غیض وغضب کو دبا نہیں پائے گا لیکن اللہ کو نہ جانے کس کی آزمائش منظور تھی۔ زیست کی یا کرم کی۔

دونوں طرف عجب حال تھا۔ زیست قدموں کی دھمک پر متوجہ ہوئی تھی۔ سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو زمین و آسمان نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا وجود بم باندھ کے اڑا دیا ہو اور وہ کئی ٹکڑوں میں بکھر گئی ہو۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

لفظوں کا ربط ٹوٹ چکا تھا۔

"کر......م؟" بڑی مشکل سے زبان ہلی تھی۔ کرم بھاری قدم اٹھاتا اس کے قریب اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں جیسے لہو پکار رہی تھیں۔ زیست صوفے کے قریب زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی اس کے چہرے پہ موجود سرخ انگلیوں کے نشان بتا رہے تھے کہ حویلی آتے ہی اس پہ کسی نے اپنا غبار نکالا ہے۔ جب ہی وہ اس طرح بیٹھی گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی۔ لیکن اب اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ کرم خان کا غصہ دیکھتی، وہ خوف یا صدمے کی تاب نہ لا سکی اور فرش پہ ڈھلک گئی تھی۔ کرم نے قدم وہیں سے واپس موڑ لیے تھے۔ اس کی مٹھیاں اور لب بھینچے ہوئے تھے۔

☆☆☆

اسے دو دن ہو چکے تھے حویلی میں آئے ہوئے اور ملازمہ کی زبانی پتا چلا کہ وہ دو دن سے بخار میں پھنک رہی تھی۔ لیکن باقی سب کی طرح یہ اطلاع کرم کے بھی کانوں کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ وہ دو دن سے اپنے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اس کا ڈیرہ مستقل مردان خانے میں لگا ہوا تھا۔ وہ دو دن سے سویا بھی نہیں تھا، جب ہی اماں جان کو تشویش ہوئی تھی۔

"تم اگر دو دن سے اس لڑکی کی وجہ سے کمرے میں نہیں جا رہے تو میں اس کا بھی بندوبست کر دیتی ہوں۔ اس کا بوریا بستر اوپر اسٹور روم میں پھینک آتی ہوں۔" انہوں نے بیٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"نہیں اماں جان...... نہیں...... اس لڑکی کو میرے کمرے میں ہی رہنے دیں بڑے حساب نکلتے ہیں اس کی طرف۔ میرے سامنے رہے گی تو میرا زخم تازہ رہے گا اور اگر میرا زخم تازہ رہا تو درد وہ بھی سہے گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ماں کو روک دیا تھا۔

"لیکن کرم!"

"اماں جان کرم نرم نہیں رہا۔ پتھر ہو گیا ہے، پتھر...... جس پہ اب کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا۔"

اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہا تھا، عجیب بہکا انداز تھا وہ خاموش سی ہو گئیں اور وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا جہاں سے ارقم باہر نکل رہا تھا۔

"کیا بات ہے، کدھر آئے تھے تم؟" کرم کا لہجہ سخت تھا۔

"وہ لالہ میں...... میں آپ کو ہی دیکھنے آیا تھا۔" کرم کے تیور دیکھ کر وہ بے چارہ گھبرا گیا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلا کر اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

زیست صوفے پہ بیٹھی دونوں پاؤں سمیٹے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ہوئے تھی، کرم کی آواز اور آہٹ پہ یک دم سر اٹھا کر سیدھی ہوئی تھی۔ کرم کو بیڈ کی سمت بڑھتا دیکھ کر وہ نقاہت کے باوجود تیزی سی تیزی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں اور ندامت سے بھری ہوئی تھیں، یوں جیسے پانی سے لبالب بھرا پیالہ چھلکنے کے لیے بے تاب ہو۔

"راستے سے ہٹو۔" وہ سرد ٹھہرا دینے والے لہجے میں بولا تھا۔

"مکرم خان، مجھے معاف کردو، میں تمہاری مجرم ہوں، پلیز مجھے معاف کردو۔" وہ روتے ہوئے التجا کرتی اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ چکی تھی۔ اس کے آنسو چھم چھم بہہ رہے تھے۔

"میں نے کہا راستے سے ہٹو۔" وہ زیست کو دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی نظروں کو ادھر اُدھر بھٹکائے ہوئے تھا۔

"مجھے معاف کردو، میں ہٹ جاؤں گی۔" وہ ضد کر رہی تھی۔

"دیکھو، میں اس وقت کچھ نہیں کہنا چاہتا، بس میرے راستے سے ہٹ جاؤ، چھوڑو راستہ۔" وہ اپنا آپ کنٹرول کرنے کی حتی الامکان کوششیں کر رہا تھا، لیکن زیست التجائیں کیے جارہی تھی۔

"میں نہیں ہٹوں گی تم نے جو کہنا ہے کہو مجھے۔" وہ ذرا سی سرکشی سے کیا بولی، مکرم کا دماغ گھوم گیا۔ اس کا بھاری ہاتھ زنانے سے اس کے چہرے پہ پڑا۔ زیست توازن قائم نہ رکھ سکی اور سائیڈ ٹیبل کے قریب جا گری۔

"جب کہہ رہا ہوں مجھے مت چھیڑو تو پھر کیوں جاؤ کہ مت چھیڑو..... تم اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کسی نئے ڈرامے، کسی نئے ناٹک کی امید رکھتی ہو؟ حالانکہ تم جانتی ہو بھی کہ تم جیسی گھٹیا عورت کے دام میں مرد صرف ایک بار ہی آتا ہے بار بار نہیں۔"

مکرم کا لہجہ حقارت اگل رہا تھا، اس نے جھک کر زیست کو دوبارہ اٹھاتے ہوئے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"مجھے معاف کردو مکرم خان، میں ایسا نہیں چاہتی تھی مگر مجھ سے ایسا ہو گیا۔"

وہ سر میں لگنے والی چوٹ بھول کر پھر سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ چکی تھی۔

"تم سے ایسا ہو گیا؟ یا تم نے ایسا کیا؟ تم نے مجھ پہ..... مجھ پہ دس ہزار کی شرط لگائی؟ تم نے میرے دل کا سودا دس ہزار میں طے کیا؟ تم نے میرے جذبات میرے خواب دس ہزار کی خاطر روندڈالے؟ تم نے دس ہزار کے لیے میری محبت کی توہین کی!"

وہ غرا کر کہتا، جیسے پاگل ہونے لگا تھا اور اس کے اندر کی آگ زیست کے جسم پہ نکل رہی تھی، جہاں جہاں وہ مار رہا تھا سرخ اور پھر سیاہ نشان بنتے جا رہے تھے۔ زیست کی گھٹی گھٹی چیخیں اماں جان کو بے چین کر گئیں۔ انہوں نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔ مگر وہ ہوش میں ہوتا تو دروازہ کھولتا نا؟ آخر میں اس نے بے دم ہوتی زیست کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔

"تمہاری وجہ سے اس روز میں..... میں اپنے..... اپنے آغا جان سے "نہیں" نہیں مل سکا، تمہاری وجہ سے میں، ان سے ملنے نہیں آیا۔ وہ..... وہ..... میرے انتظار میں، مر گئے مجھ سے ملنے کی، آس لے کر چلے، چلے گئے وہ، تمہاری وجہ سے، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ اس کا گلا گھونٹتے ہوئے بپھر رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں لڑھک گئی تھی اور وہ اسے صوفے پر دھکیل کر خود بیڈ پہ گر گیا تھا۔

☆☆☆

زیست کی حالت دیکھ کر ارقم اور اماں سائیں دنگ رہ گئے تھے۔انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ اس کا یہ حال بکرم خان آفریدی نے کیا ہے۔وہ حیران پریشان تھے کہ کیا بکرم اس حد تک سفاک ہو گیا ہے؟

وہ صبح سکون سے اٹھا اور بے جان پڑی زیست کو یکسر نظر انداز کرتا واش روم میں گھس گیا،نہا کر واپس آیا اور تیار ہو کر کمرے سے نکل گیا تھا اور اس کے جاتے ہی ارقم اور اماں سائیں بھاگے بھاگے آئے تھے۔مگر وہ تو جیسے خون میں لت پت پڑی تھی اس کا پورا جسم نیل و نیل ہو رہا تھا۔

اماں سائیں چاہنے کے باوجود اپنے آپ کو سنگدل نہیں بنا سکی تھیں۔حالانکہ ان کو بیوہ کرنے والا زیست کا بھائی تھا،لیکن وہ اس کو بھی رب کی رضا جان کر صابر و شاکر ہو گئی تھیں اور رب کی رضا کی سزا وہ کسی اور کو نہیں دینا چاہتی تھیں۔لیکن بکرم ایسی باتوں کو سمجھنے کے دور سے نکل چکا تھا۔ حالانکہ ایسی باتیں وہی ان کو بتاتا تھا سب ہی کو صبر اور تحمل سکھاتا تھا لیکن آج خود ہی غضب کی انتہا کرتا پھر رہا تھا۔

"تم سکینہ سے کہو تھوڑا پانی گرم کر دے،میں اس کے زخم صاف کر دوں۔"انہوں نے ارقم سے کہا۔

"جی ابھی کہہ دیتا ہوں۔"وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

"اپنے شوہر کے قاتلوں سے تجھے بڑی ہمدردی ہو رہی ہے؟"دادی تسبیح ہاتھ میں لیے ناک بھوں چڑھاتی ہوئیں اندر آ گئیں۔

"میرے شوہر نے مجھے ہمیشہ جو کچھ سکھایا ہے میں وہی کروں گی نا؟"انہیں دادی کی ناگواری کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"ہونہہ شوہر کی پروا نہیں ہے تمہیں اس کی باتوں کی بھلا کیا ہو گی؟"

"یہ تو میرا رب جانتا ہے نا کہ مجھے پروا ہے یا نہیں؟میں ایک انسان کی غلطی کی سزا دوسرے کو کیسے دوں؟قتل اس کے بھائی سے ہوا ہے اور عذاب ہم اس لڑکی پہ نازل کریں،یہ کہاں کا انصاف ہوا بھلا؟"

وہ سچ اور حقیقت پسندی سے کام لے رہی تھیں لیکن دادی کو یہ سچ گوارہ نہیں تھا،وہ بہو کے خلاف دل میں بغض لیے وہاں سے چلی گئی تھیں۔تھوڑی دیر بعد ارقم ملازمہ کو ساتھ لے آیا اور پھر اس کی پٹی وغیرہ کر کے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔اسے گرم دودھ پلایا،درد کی ٹیبلٹ دی اور آرام کرنے کا کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔لیکن زیست ان کی اس قدر نرمی اور ہمدردی کو دیکھ کر ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑ کر رو پڑی تھی اور وہ اس کا اس طرح شدت سے رونا دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔دوسرے ہاتھ سے اس کا سر تھپکا اور باہر آ گئیں۔

☆☆☆

وقت دو چار قدم آگے بڑھا تو زندگی کے دو،چار قدم پیچھے سرک گئے تھے،دلوں پہ لگنے والے زخموں کی سطح پہ کھرنڈ آ گیا تھا اور کھرنڈ آنے کا مطلب تھا کہ "صبر" آ گیا تھا۔وہ صبر چاہے حشمت علی خان کو بیٹی کی قسمت اور جدائی پہ آیا،چاہے بکرم خان آفریدی کو باپ کی موت پہ آیا،چاہے زیست علی کو اس قدر چاہنے والے بکرم خان کی بے رحمی اور سنگدلی پہ آیا لیکن بہر حال آیا ضرور تھا۔کیونکہ وقت سب کچھ پیچھے چھوڑتا جا رہا تھا۔

زندگی ایک ڈگر پہ چل نکلی تھی۔جس طرح بکرم خان آفریدی آزاد زندگی سے نکل کر ذمہ داریوں میں پڑ گیا تھا اسی طرح زیست آزاد فضاؤں میں اڑتے اڑتے قید ہو گئی تھی موجودہ طرز زندگی بے شک اس کے لیے مشکل تھا لیکن کرنا تو تھا وہ سب کچھ جو اس کے مالک چاہتے۔

یہاں آنے کے پانچویں روز بعد ہی دادی کے حکم پہ ملازمہ اس کو گھسیٹ کر باہر لے آئی تھی اور پھر ہال کمرے کے بیچوں بیچ مجرم کی طرح کھڑا کر کے دادی نے جو بھی حکم جاری کیے وہ سر جھکائے سنتی رہی۔ اس وقت وہاں حویلی کی تمام عورتیں اور ملازم موجود تھے۔ دادی نے اس پہ کئی پابندیاں عائد کی تھیں اور کئی کام اس کو سونپے تھے اور ان میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی اور زیست چپ چاپ سب کچھ قبول کرتی چلی گئی۔ اسے کسی تکلیف کسی اذیت کی کوئی پروا نہیں تھی، بس پروا تھی تو کرم خان کی، دکھ تھا تو صرف اس کا تھا۔ جو بدل گیا تھا جو واقعی بدل گیا۔

☆☆☆

''خان جی! آپ کی چائے۔'' وہ بیڈ پہ تکیوں کے سہارے نیم دراز لیٹا آنکھیں بند کیے شاید سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب آ کر آہستگی سے بولی۔ ''خان جی؟'' کہنا بھی دادی کا حکم تھا۔ کیونکہ خان جی کی پگ کرم کے سر پہ جو رکھی گئی تھی، تو پھر خان صاحب کہلوانے کا اسے پورا پورا حق تھا۔ ''خان جی!'' وہ پھر آہستگی سے بولی، اس کی اتنی جرات نہیں تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا ہی ہلا دیتی۔

''ہوں! سن رہا ہوں، رکھ دو۔'' وہ آنکھیں بند کیے اسی طرح لیٹا رہا۔

زیست جانتی تھی وہ کافی تھکا ہوا ہے، وہ ایک پنچایت کے سلسلے میں ڈیرہ اسماعیل خان گیا ہوا تھا اور آج دو دن بعد واپس آیا تھا۔

''تھک گئے ہیں؟'' وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ [illegible] کی طرف آ کر بیٹھ گئی اور اس کی کھیڑی کا اسٹریپ کھول کر کھیڑی اتارنے لگی، وہ ہنوز آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ سیاہ رنگ کی کھیڑی اس کے پاؤں میں بہت خوب صورت لگتی تھی۔ وہ شلوار سوٹ کے ساتھ ہمیشہ کھیڑی ہی پہنتا تھا، وہ جب بھی تھکا ہارا واپس گھر آتا اور آ کر بیڈ پہ لیٹتا اس کے جوتے زیست ہی اتارتی تھی۔ لیکن زیست کو ہمیشہ اس کے پاؤں میں کھیڑی اچھی لگتی تھی۔

وہ آہستگی سے اس کے پاؤں سہلانے لگی۔ لیکن اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی کرم نے یک دم پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے اور یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں اتنا بھی نہیں تھکا ہوا کہ اپنی تھکن اتارنے کے لیے تمہیں سہارا بناؤں، مجھے تم سے اتنی نفرت ہے کہ میں اپنی تھکن بھی تمہیں نہیں سونپ سکتا۔''

اس کے لفظ آگ کی طرح زیست کے وجود سے لپٹ گئے تھے۔ وہ جل کر راکھ ہو گئی تھی اور ایسا تو وہ پچھلے دو سال سے برداشت کرتی آ رہی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے کرم خان کی نفرت اور حقارت سہتے ہوئے اور دو سال ہو گئے تھے وہ سب کچھ خاموشی سے چپ چاپ برداشت کیے جا رہی تھی، صرف اور صرف اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو کرم خان کا مجرم سمجھتی تھی اور ایک مجرم ہونے کے ناتے وہ کرم خان کے رویے کو حق بجانب سمجھتی تھی اس نے اس کے رویے پہ کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کی تھی، بس لب سیے سب کچھ سہتی جا رہی تھی۔

''بھرجائی!'' اچانک ارقم دروازہ بجا کر اندر آ گیا۔ لیکن سامنے بیڈ پر کرم کو دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ وہ کرم کے سامنے زیست سے بات چیت کرنے سے گریز کرتا تھا کیونکہ کرم کو ارقم اور اماں جان کی اس کے ساتھ اپنائیت اور ہمدردی قطعی پسند نہیں تھی۔

''کیا بات ہے؟'' زیست فوراً بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔

"راغب علی نے آغا جان کا قتل کیا تو اس میں بھرجائی کا کیا قصور ہے؟ آپ انہیں معاف کیوں نہیں کر دیتے؟ لالہ سائیں! آپ بے شک آغا جان کی جگہ ان کی گدی سنبھال چکے ہیں لیکن مجھے پتا ہے آغا جان کو آپ کو اس انداز میں دیکھ کر کبھی خوشی نہیں ہوگی۔ ان کی خوشی دو سال پہلے والا مکرم خان تھا، آج والا نہیں۔"

ارقم نہ جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن مکرم سے مزید سنا نہیں گیا، اس نے ارقم کو واپس بھیج دیا اور دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں مسلتا دوبارہ لیٹ گیا تھا۔ سرہانے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

باہر بہت تیز بارش ہو رہی تھی، نومبر کی اوائل راتیں تھیں، ٹھنڈک معمول سے بڑھ گئی تھی۔ وہ شام سے سردار خورشید خان کی عیادت کے لیے گیا ہوا تھا کہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے بیمار تھے۔ ان کے پاس بیٹھے بیٹھے کافی ٹائم ہو گیا واپسی کے لیے اٹھا تو بارش شروع ہو گئی، لیکن اب وہ بارش کو دیکھ کر رُک تو نہیں سکتا تھا۔

حویلی پہنچنے تک رات گہری ہو چکی تھی یا پھر بارش کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا بہرحال پوری حویلی میں گہرا سناٹا تھا، بارش اور سردی کی وجہ سے بھی وقت سے پہلے ہی اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے تھے۔ وہ اپنی چادر سے بارش کی بوندیں جھاڑتا ہوا لمبے لمبے ڈگ بھرتا مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔ چادر بازو پہ ڈالتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بھی بند کر دیا تھا، پھر پلٹ کر چادر صوفے پہ اچھالی اور بیڈ پہ بیٹھ کے جوتے اتارے۔

اس نے اک نظر دیکھا، وہ سو رہی تھی ورنہ یہ کام اسی کو کرنا ہوتا تھا جوتے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ خود بھی سونے کے لیے لیٹ گیا تھا اور ساتھ ہی زیرو پاور کا بلب جلا دیا۔

وہ بستر پہ لیٹا تو ہر سو چھانے والے سناٹے کا مزید احساس ہوا ماحول میں صرف بارش اور طوفان کی سائیں سائیں کی آواز گونج رہی تھی۔ تیز ہوا کی سرسراہٹ بہت خوف ناک سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

مکرم نے باہر کے ماحول سے دھیان ہٹا کر اندر کے ماحول پہ توجہ کی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور کروٹ بدلنے سے اس کی نظر فرش تک چلی گئی جہاں پہ زیست کا بستر لگا ہوا تھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھے اس کی طرف پشت کیے کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور کندھوں تک موٹا سا کھیس اوڑھا ہوا تھا، حالانکہ سردی بلا کی تھی وہ اپنے اوپر کمبل پھیلائے ہوئے تھا لیکن پھر بھی سردی کا احساس کم نہیں ہو رہا تھا اور ایک وہ تھی جو فرش پہ بستر لگائے سو رہی تھی اور پچھلے دو سالوں سے وہ اسی بستر پہ سو رہی تھی، ہر سردی اور ہر گرمی اس نے اسی طرح فرش پہ سو کر گزاری تھی۔

مکرم کروٹ کے بل لیٹا اپنے بازو پہ سر رکھے مسلسل اس کے فقیرانہ حلیے کو دیکھ رہا تھا کیا یہ وہی زیست تھی جس کے انداز و اطوار سے شاہانہ پن جھلکتا تھا۔ جس کی چال میں تمکنت تھی، جس کے ڈریس اور میک اپ کمال کے ہوتے تھے جو گاڑی ڈرائیو کرتی تو گاڑی میں فاسٹ میوزک بج رہا ہوتا تھا، جو لوگوں کے دل جیتنے اور ان کو قابو میں کرنے کی شرطیں باندھ لیتی تھی اور یہ سچ تھا کہ جیت بھی اسی کا مقدر ہوتی تھی اور آج شاید اس کا یہ بستر یہ درویشانہ انداز اور رہن سہن بھی اس کی جیت کی وجہ سے مقدر بنا ہوا تھا۔

اس وقت اگر اس نے مکرم خان پر شرط نہ لگائی ہوتی تو یقیناً آج وہ اس کا دل جیت چکی ہوتی اور وہ فرش پہ سونے کے بجائے اس کے بیڈ پر اس کے پہلو میں سو رہی ہوتی۔ لیکن بات یہ تھی کہ وہ پہلے ایک بار جیت چکی تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ ہر بار جیت ایک ہی انسان کا مقدر بنے؟ اب اس کی جیت کے کوئی امکان نہیں تھے۔ اب اسے ہارنا ہی ہارنا تھا۔

مکرم نے اسے دیکھتے دیکھتے ایک فیصلہ کیا اور پھر دوسری طرف کروٹ لے کر اطمینان سے سو گیا تھا۔ لیکن بارش ابھی بھی برس رہی تھی۔ ایک بارش کمرے سے باہر تھی اور ایک بارش کمرے کے اندر...... وہ کروٹ لیے بے آواز رو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھا کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا اور اتفاقاً زیست بھی وہیں ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی۔

"سوری، میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ میں نے بزنس ہینڈل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ میرا سارا بزنس میرا کزن سنبھال رہا ہے وہ کیا کچھ کر رہا ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کیونکہ اب وہ بزنس اس کا ہے لہٰذا آپ نے جو بھی بات کرنی ہے اسی سے کیجیے۔ البتہ آپ کو اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ میں ضرور کر دوں گا۔"

وہ کافی سکون سے کسی کو سمجھا رہا تھا اتنے میں زیست ہاتھ میں کپڑا تھامے اس کے سامنے پڑی ٹیبل کی سطح صاف کرنے کے لیے جھکی اور بلا ارادہ ہی مکرم کی نظر اس کی سمت اٹھ گئی۔ اس کی گردن میں جھولتی چین اس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا چکی تھی یہ چین تقریباً ڈھائی سال پہلے اس نے اس کی گردن میں خود پہنائی تھی اور مکرم کی طرف سے زیست کے لیے یہ چین محبت کا پہلا اور آخری تحفہ تھا، سو اس نے ابھی تک سینے سے لگا رکھا تھا۔ شاید مکرم کی پہلے بھی اس پہ کئی بار نظر پڑی تھی لیکن بے دھیانی اور غصے کے باعث وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر سکا تھا۔ مگر اس وقت اس کا دھیان اور اس کی نظروں کا مرکز وہی چین تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ فون پہ باقی بات ٹھیک سے نہیں کر پایا تھا اس کی توجہ منتشر ہو چکی تھی دوسری طرف ہیلو ہیلو پکارنے کے بعد فون بند ہو چکا تھا اور ادھر زیست بھی کام ختم کر کے ڈرائنگ روم سے جا چکی تھی۔ لیکن اس کی نظروں میں ابھی تک اس کے گلے میں جھولتی چین کا منظر گھوم رہا تھا۔

"لالہ سائیں!" اس کی چچازاد کزن پلوشہ نے اسے مخاطب کیا۔

"ہوں!" وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

"دادی نے آپ کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔"

"کیوں خیریت؟" اس نے ٹھٹک کے پوچھا

"یہ تو دادی کو ہی پتہ ہوگا۔" پلوشہ نے کندھے اچکائے۔

"اماں جان کہاں ہیں؟" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"کہیں بیٹھی ہوں گی اپنی بیوہ دانی سے ہمدردی جتانے کے لیے۔"

پلوشہ تمسخر سے کہتی وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

کوئی اور معاملہ ہوتا تو مکرم اس طرح بات کرنے پہ اسے جھڑک کے رکھ دیتا، لیکن یہ معاملہ زیست کا تھا، تبھی اکثر وہ ہر جائز و ناجائز پہ بھی چپ رہ جاتا تھا کیونکہ وہ اس کے حق میں ہرگز نہیں بولنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر دادی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، جب اچانک اماں جان سامنے آ گئیں۔

''بڑی اماں کے کمرے میں جانے سے پہلے تم میری بات سن لو۔'' ان کا لہجہ انتہائی سنجیدہ تھا۔

''اماں جان! خیریت تو ہے نا؟'' وہ پریشان ہوا۔

''ہوں خیریت ہے، میرے کمرے میں آؤ۔ وہ اسے اشارہ کر کے آگے بڑھ گئیں اور مکرم ان کے پیچھے ان کے کمرے میں آ گیا تھا۔

''بیٹھو'' انہوں نے دروازہ بھیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''زیست کو یہاں تم کیا بنا کے لائے ہو؟ ان کا سوال عجیب تھا، وہ الجھا سا گیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ تم زیست کو کیا بنا کے لائے تھے؟'' وہ سختی سے بولیں۔

''جی! بیوی۔'' اس نے بڑی وقت سے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔

''بیوی کے حقوق و فرائض ادا کیے تم نے؟''

ان کے کھرے کھرے سوال پہ مکرم نظر چرا گیا۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکی پہ کیوں اتنے ظلم و ستم ڈھاتے جا رہے ہو؟ کیوں اس کے صبر کا امتحان لے رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو آخر؟ تین سال ہونے کو آئے ہیں تم نے آج تک سیدھے منہ اس سے بات تک نہیں کی۔ تم نے اسے بیویوں والا حق نہیں دیا، کبھی اس کے دکھ تکلیف کا خیال نہیں کیا، کبھی اسے پاس بلایا نہیں، بٹھایا نہیں لیکن..... لیکن پھر بھی آفرین ہے اس لڑکی پہ جس نے کبھی منہ سے ''سی'' تک نہیں کی۔ کبھی کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی، جو دیا کھا لیا، جو کہا پہن لیا، اس نے صبر کی انتہا کر دی لیکن تم نے تم نے جبر کی انتہا کر دی۔ ایسا کیا گناہ ہو گیا ہے اس بے چاری سے کہ تم معاف ہی نہیں کر رہے؟ اس کی سزا ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی؟ جاؤ دیکھو سردار خورشید خان کی بیوی کو وہ بھی خون بہا میں آئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ سردار خورشید خان کے گھر اور خاندان پہ راج کر رہی ہے۔ لیکن یہاں تو پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنائے جا رہے ہیں، تمہاری دادی کو تمہارے بچوں کا شوق ہو رہا ہے اور وہ تمہاری دوسری شادی کروانے کا سوچ رہی ہیں، انہوں نے لڑکی بھی دیکھ لی ہے۔ بس تمہاری ہاں کی ضرورت ہے۔'' اماں سائیں نے سب کچھ بڑے طنز اور تمسخر سے کہا تھا اور مکرم، دادی کے منصوبے کا سن کر حیران پریشان رہ گیا تھا۔ لیکن جو کچھ اس کی اماں سائیں نے کہا تھا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ نہا کر باتھ روم سے باہر نکلا تو زیست الماری سے اس کے کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھنے لگی، کپڑے رکھنے کے بعد جوتے نکالنے کے لیے وہ ریک کی سمت بڑھی لیکن اچانک اس کا بازو کرم کی گرفت میں آ گیا تھا اور زیست کو لگا پوری دنیا اس کی نگاہوں میں گھوم کے رہ گئی ہو۔ اس نے حیرت سے کرم کی سمت دیکھا، وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تم بیوی ہو میری، تمہیں چھونے کا پورا پورا حق ہے مجھے، اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟''

وہ عجیب انداز سے کہتا اس کے بے حد قریب آ کھڑا ہوا تھا لیکن زیست کی حیرانی ابھی بھی کم نہیں ہوئی تھی وہ آنکھیں پھیلائے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں آج جا رہا ہوں، شام کو واپسی پر تم سے ملوں گا۔''

اس نے زیست کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور زیست کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اتنے سالوں سے ساکت و صامت بیٹھے دل کی دھڑکنیں اچانک زندہ ہو گئی تھیں اور ان دھڑکنوں کی آواز کرم خان با آسانی محسوس کر رہا تھا۔

''مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے، تم تیار رہنا۔'' اس نے زیست کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا۔

''جانتی ہو میں کیسا تیار ہونا کہہ رہا ہوں؟'' اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا نہ چاہتے ہوئے بھی زیست کی پلکیں جھک گئی تھیں۔

''یہ میلے کپڑے اتار کر نئے اور صاف ستھرے کپڑے پہنو، ان الجھے بالوں کو شیمپو کرو، ان کو سلجھاؤ، جسم کو خوشبو میں نہلا دو اور ان ہونٹوں کو ان کو تم نہیں ان کو میں خود رنگ دوں گا ہوں سارے رنگ بخشوں گا اور ہاں کاجل مت لگانا، کاجل بہہ جائے گا۔''

اس نے زیست کے اک اک نقش چھوتے ہوئے اس سے فرمائش کی تھی اور زیست تو جیسے پاگل ہی ہو اٹھی، اسے لگا وہ اتنے سالوں بعد کھڑے کھڑے سہاگن ہو گئی ہو۔

''جو کہہ رہا ہوں سن رہی ہو نا؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہوں!'' وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی اور کرم خان اسے ایک بار زور سے بانہوں میں بھینچ کر بانہوں کے حلقے سے آزاد کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

چند منٹوں میں وہ تیار ہوا اور کمرے سے چلا گیا، لیکن زیست کے پاس خوشیوں کا اک جہان چھوڑ گیا تھا، وہ اتنی خوش تھی کہ خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اتنا طویل ہجر کاٹنے کے بعد وصل کی کوئی کرن نظر آئی تو دل پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ آج کرم سے اپنی محبت کا اظہار ضرور کرے گی۔

اس محبت کا اظہار جو اسے شرط جیت جانے کے بعد کرم خان سے محسوس ہوئی تھی جس محبت کا ادراک بہت بعد میں ہوا تھا اور جس کا اظہار کرنے کے لیے وہ دنوں اسے ڈھونڈتی پھری تھی، لیکن وہ اسے کہیں نہیں ملا تھا۔ لیکن وہی کرم اسے آج ملا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ کچھ بھی نہیں چھپائے گی سب کہہ ڈالے گی۔

اس خوشی میں وہ پورا دن چہکتی پھری، اس کی خوشی ارقم اور اماں جان نے بھی محسوس کر لی تھی۔

''کیا بات ہے بھئی؟ بڑی اڑی اڑی پھر رہی ہیں؟'' ارقم چھیڑنے لگا۔

''بہنوں کو اس طرح چھیڑتے ہیں کیا؟'' زیست نے گھور کے کہا۔

''تو پھر کس طرح چھیڑتے ہیں؟'' وہ شرارت سے بولا اور زیست اس کی بات پہ ہنس پڑی۔

''بہت خراب ہو تم۔'' اس نے ارقم کا کان کھینچا۔

''لالہ سائیں سے تھوڑا کم ہی خراب ہوں۔'' وہ جتانے سے باز نہ آیا۔

''یہ تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی یوں لگ رہا تھا جیسے آج اچانک پہلے والی زیست زندہ ہو کر سامنے آ گئی ہو۔

ارقم کو اس کا خوش باش چہرہ دیکھ کر دلی خوشی کا احساس ہوا تھا اور ایسی ہی خوشی اماں جان کو بھی ہوئی تھی۔ انہیں احساس ہوا کہ بچ بچ مکرم کو ان کی باتیں سمجھ آ گئی تھیں۔ انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا تھا۔

☆☆☆

اس کے پاس کوئی بالکل نیا سوٹ تو نہیں تھا۔ لیکن چار پانچ سوٹ ایسے تھے جن میں صرف ایک ذرا بہتر حالت میں تھا یہ بھی دادی بیگم کے حکم پہ اسے عنایت کیے گئے تھے نہ تو وہ بہت زیادہ قیمتی تھے نہ ہی ان کا کوئی رنگ اچھا تھا لیکن یہ سوٹ ذرا قابل قبول تھا اور زیست نے بہت کم پہنا تھا اس لیے اس نے آج پہننے کے لیے اسی سوٹ کا انتخاب کیا تھا ڈارک براؤن کلر کا یہ شفون کا سوٹ اسے اماں جان نے سب سے چوری چھپے دیا تھا لیکن جب زیست نے پہنا تو دادی بیگم کو خبر ہو گئی اور پھر انہوں نے دونوں کی کلاس لی تھی۔ لہٰذا یہ سوٹ وہ جب بھی پہنتی اندر سے ڈرتی ہی رہتی تھی لیکن آج اسے کوئی پروا نہیں تھی وہ کچھ بھی کہہ لیتیں، وہ سننے کو تیار تھی۔

اس نے نہا کے کپڑے پہنے، خوشبو لگائی، بال سنوارے، مکرم کی پسند کے تمام کھانے بنا ڈالے، دن بھر ارقم آتے جاتے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے چھیڑتا رہا اور زیست شام ہوتے ہی اس کے انتظار میں لگ گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی لیٹ ہو چکا تھا۔ لیکن آج زیست کو اس کا انتظار ہمیشہ سے ہٹ کے تھا، آج اس کی یہ خوشی ہی بہت اچھا تھی کہ مکرم خان نے اسے معاف کر دیا تھا۔

''خان جی آ گئے ہیں۔'' وہ کمرے کی طرف جا رہی تھی، جب ملازمہ کی اطلاع پہ اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

''اچھا مجھے بتایا ہی نہیں چلا؟'' وہ حیران ہوتی اندر آ گئی۔ مکرم کپڑے تبدیل کر کے نکل رہا تھا۔

زیست کو دیکھ کر قدم ٹھہر سے گئے۔ وہ کوئی بھی سنگھار نہ ہونے کے باوجود اپنی شرم و حیا اور دوشیزگی کے باعث بچ بچ نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی، مرجھائے ہوئے چہرے پہ ایک دن میں ہی گلابیاں لوٹ آئی تھیں۔ کیا اس کا نرم رویہ اتنا اثر رکھتا تھا اس پہ؟ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا اور پھر آہستگی سے خود ہی سر جھٹک دیا تھا۔

''خان جی!'' زیست نے کچھ کہنا چاہا۔

''ہوں؟'' وہ گھڑی اتار کر ٹیبل پر رکھ رہا تھا، زیست وہ گھڑی دیکھتی رہ گئی۔ یہ اسی نے تو گفٹ کی تھی۔ لیکن تین سال ہو گئے تھے زیست نے یہ گھڑی اس کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن آج؟ وہ اندر سے سرشار ہو گئی۔

''چپ کیوں ہو گئی ہو؟'' وہ اسے سرتاپا گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ زیست کچھ کہنے سے پہلے ہی گڑبڑا گئی۔

''کھانا لگاؤں آپ کے لیے؟'' اس نے بات بدل ڈالی۔

''ہوں لگاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔

وہ تیزی سے واپس مڑ گئی، ابھی بھی اس کے دل کی حالت نازک تھی، وہ اس کی ایسی کرم نوازی سہہ نہیں پا رہی تھی۔

باقی سب کھانا کھا چکے تھے، وہ لیٹ آیا تھا اس لیے اسے اکیلے ہی کھانا تھا، جبھی ڈائننگ ہال میں وہ دونوں اکیلے تھے، زیست پلیٹ میں چاول نکال کر اس کے سامنے رکھنے کے لیے قریب آئی تو اس کے وجود سے اٹھنے والی مہک نے مکرم کو مسحور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، وہ اسے سراپے کو جانچتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''چائے بھی بناؤں؟'' اس نے کچن کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''پانچ منٹ بعد چائے بنا کر کمرے میں لے آؤ۔''

وہ کھانا ختم کرتے ہوئے بولا، لیکن زیست کو پانچ کے بجائے پچیس منٹ لگ گئے، برتن سمیٹ کر استعمال شدہ برتن دھونے کی ڈیوٹی بھی اس کی تھی، سو ڈیوٹی تو پوری کرنی ہی تھی۔

جب وہ چائے لے کر اندر آئی تو مکرم بیڈ پر نیم دراز تھا اور ریموٹ سے ٹی وی کے چینل سرچ کر رہا تھا۔

''چائے!'' وہ پاس آ کر بولی۔

''رکھ دو۔'' اس نے دیکھے بنا کہا۔ وہ کپ رکھ کے پیچھے ہٹی۔

''دروازہ بند کر کے ادھر آ کر بیٹھو۔'' اس نے بیڈ پہ اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

زیست کے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس نے سرخ چہرے کے ساتھ بمشکل دروازہ بند کیا اور بیڈ کے قریب آئی۔

''بیٹھو۔'' وہ ذرا سا پیچھے ہوا تا کہ وہ بیٹھ سکے، وہ اپنی ہمتیں، اپنے حوصلے مجتمع کرتی بیٹھ گئی۔

مکرم نے چائے کا کپ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔

''آج کیسا لگ رہا ہے؟'' اس نے زیست کو تھوڑا اور قریب کرتے ہوئے پوچھا، وہ اس سوال پر سر جھکانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

''پلیز ڈیئر وائف اشرماؤ مت، اپنے اسی اعتماد سے بتاؤ جو تمہاری شخصیت کا حصہ ہے، سچ سچ بتاؤ اچھا لگ رہا ہے نا؟'' وہ انتہائی گمبھیر لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا، اور زیست کو گردن اثبات میں ہلانی پڑی۔

''آج خوش ہو تم؟'' وہ کپ واپس رکھتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام چکا تھا۔

"بہت زیادہ۔" وہ دل کی گہرائیوں سے بولی۔ مگر دھیمے انداز میں۔

"دیکھو میں ایک مرد ہوں اور مرد کے جذبات بہت ہی منہ زور اور اندھے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی پچھلے تین سال سے میں اپنے جذبات کو لگام ڈالتا آ رہا ہوں، صرف اس لیے کہ مجھے تمہیں چھونا بھی گوارا نہیں تھا۔ میں تمہارا راغب علی خان کی بہن ہونا تو معاف کر سکتا تھا، لیکن تمہاری شرط کے بدلے ہونے والی توہین، اپنی ہتک بھی معاف نہیں کر سکتا تھا، میں بہت اچھا اور نارمل انسان تھا، لیکن تمہاری "تفریح" نے مجھے سنگدل بنا ڈالا، میری زندگی ہی بدل کر رکھ دی، مجھے عرش سے فرش پہ پھینک دیا، اتنی لڑکیوں کے درمیان ہونے والی اتنی تذلیل نے مجھے کبھی سونے نہیں دیا، میں اپنے باپ کی موت کا غم اور تمہارے فریب کی چوٹ اتنے دن اپنے ساتھ لیے پھرتا رہا، رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پہ آیا تو پتا چلا کہ میرے کمرے کے فرش پہ ایک لڑکی سوتی ہے۔ پچھلے دنوں دادی نے مشورہ دیا کہ دوسری شادی کر لو، میں نے بھی سوچا کہ اچھا آئیڈیا ہے، میں بھی مرد ہوں، فرشتہ نہیں، سو میں نے عورت کے وجود پہ سوچنا شروع کر دیا، تب میرا خیال تمہاری طرف گیا کہ شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ میری ضرورت کا سامان تو تم بھی کر سکتی ہو، بیوی ہو، خوبصورت ہو، ایک مکمل لڑکی ہو، مجھے اور کیا چاہیے بھلا؟ میں دوسری شادی کا جھنجٹ کیوں پالوں؟ بے شک تمہارے قریب آنا ناگوار ہی سہی، لیکن کبھی کبھی تم مجھے چند لمحوں کا سکون تو دے سکتی ہو نا؟ لہٰذا آج میں نے یہ فیصلہ کیا ہے، میں تمہیں اپنے دل میں کبھی جگہ نہیں دے سکتا، لیکن اپنے پہلو میں جگہ ضرور دوں گا، تم میرے سینے کے اندر تو نہیں لیکن سینے پر...... کھلے عام رہ سکتی ہو۔"

اسے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، اسے یقین نہیں آیا تھا کہ اسے ایسی کند چھری سے مکرم خان نے ذبح کیا ہے؟ وہ ساکت وصامت رہ گئی تھی۔

اس نے تو اس کی توہین اتنی لڑکیوں میں کی تھی لیکن مکرم خان نے ایسی چال چلی کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی، وہ اتنی ساری توہین اور ہتک کا بدلہ ایک دن اور ایک پل میں لے چکا تھا۔

اس نے زیست کو سر اٹھانے کے تو کیا نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ لائٹ بند کر چکا تھا لیکن اس کا لمس، اس کی گرفت، اس کی ایسی ضرورت بھری قربت، زیست کو خون کے آنسو رلا رہی تھی اور مکرم خان کو اس کی اذیت پہ تکلیف تو ہو رہی تھی اور مکرم خان کو اس کی اذیت پہ تکلیف تو ہو رہی تھی مگر وہ اسے کوئی بھی اظہار محبت یا معافی کا اشارہ دے کر بہادر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ زیست کو احساس دلانا چاہتا تھا کہ کسی کے جذبات سے کھیلنا اتنی معمولی بات نہیں ہوتی، کیونکہ ہمارا "کھیل" کسی دوسرے کی پوری زندگی کا سوال بن جاتا ہے۔

